اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

فروری ۲۰۲۴ء

مُدِیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan February 2024

ضرورت والنٹیئرز (رضا کاران) برائے خدمتِ قرآن

تحریک رجوع الی القرآن نے ’تدریس القرآن‘ کے نام سے ایک ایسا پیکیج تیار کیا ہے جس سے سکول کالج یونیورسٹی کے طلبہ نہایت آسانی سے اور بہت تھوڑے وقت میں قرآن حکیم کا ترجمہ کرنے کا فن سیکھ سکتے ہیں اور محض ایک پارہ پڑھ کر ہی باقی ۷۰، ۸۰ فیصد قرآن سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمیں سارے پاکستان سے ایسے خدا ترس والنٹیئرز کی ضرورت ہے جو اپنے علاقے کے سکولوں اور تعلیمی اداروں کو اس کام کی طرف راغب کریں تاکہ نوجوان نسل قرآنِ حکیم کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے قابل ہو سکے۔ یاد رہے کہ تعلیمی اداروں میں قرآن کی تعلیم اب قانوناً بھی لازمی ہے۔

تحریک نے ترجمۂ قرآن کا ایک پیکیج گھر میں بیٹھے ریٹائرڈ افراد، خواتین اور ملازمت پیشہ لوگوں کے لیے بھی تیار کیا ہے جس میں ورک بک بھی شامل ہے اور جس سے آسانی سے گھر بیٹھے ترجمۂ قرآن کرنا سیکھا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم کو صحیح مخارج سے پڑھنے کے لیے تجویدی قاعدہ اور ’تسہیل القرآن‘ کے نام سے ایک تفسیری و تفہیمی (Self Explanatory) ترجمہ بھی اس پیکیج کا حصہ ہے۔ یہ کتابیں لاگت پر مہیا کی جاتی ہیں تاکہ ان کی طباعت کا سلسلہ جاری رہ سکے۔ کوئی نفع اندوزی ادارے کے پیشِ نظر نہیں۔

اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ کتابیں طلبہ، سکولوں، حلقہ ہائے قرآن میں فی سبیل اللہ تقسیم کرنا چاہے یا ان کی اشاعت میں حصہ لینا چاہے تو ہم اسے خوش آمدید کہیں گے۔ ہم ترجمۂ قرآن سکھانے والے اساتذہ کی آن لائن و فزیکل ٹریننگ بھی بلا معاوضہ کرتے ہیں۔

سکولوں کالجوں یونیورسٹیوں کی انتظامیہ، اساتذہ، والدین، دینی کارکنوں، عام خواتین و حضرات، ناشرانِ کتب، اصحابِ خیر سب سے درخواست ہے کہ قرآن کو سمجھنے، پھیلانے اور اس پر عمل کرنے کی اس تحریک سے تعاون فرمائیں۔

تحریک رجوع الی القرآن

کیمپ آفس: 178 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

حافظ محمد عمران طحاوی 0300-4107282، ای میل ermpak@hotmai.com

سبق: ١ تدریس القرآن

سُوۡرَةُ الۡفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ

اٰیَاتُھَا ٧ — رُکُوۡعُھَا ١

متن قرآن حکیم مع ترجمہ				قرآنی لفظ	اردو استعمال
بِسۡمِ	اللّٰهِ	الرَّحۡمٰنِ	الرَّحِيۡمِ ○	بِسۡمِ	اسم، اسمائے حسنیٰ، اسماء
نام سے	اللہ	بہت رحم کرنے والا	ہمیشہ رحم کرنے والا	الرَّحۡمٰنِ	رحم، رحمت، رحیم، ارحم
(شروع) اللہ کے نام سے جو بہت زیادہ رحم کرنے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا				الرَّحِيۡمِ	رحم، رحمت، رحمان

اَلۡحَمۡدُ	لِلّٰهِ	رَبِّ	الۡعٰلَمِيۡنَ (١)	الرَّحۡمٰنِ	الرَّحِيۡمِ (٢)	اَلۡحَمۡدُ	حمد و نعت، حامد، محمود، محمد
تمام تعریف	لیے اللہ کے	پالنے والا	جہانوں	بہت رحم کرنے والا	ہمیشہ رحم کرنے والا	رَبِّ	ارباب، ربوبیت، مربی
تمام طرح کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ بہت رحم کرنے والا							

مٰلِكِ	يَوۡمِ	الدِّيۡنِ (٣)	اِيَّاكَ	نَعۡبُدُ	وَ	اِيَّاكَ	يَوۡمِ	یوم پاکستان، یوم اقبال
مالک	دن	بدلے کا	صرف تیری	ہم عبادت کرتے ہیں	اور	صرف تیری	نَعۡبُدُ	عبادت، عابد، معبود، عبد
اور ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ مالک ہے بدلے کے دن کا ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے								

نَسۡتَعِيۡنُ (٤)	اِهۡدِنَا	الصِّرَاطَ	الۡمُسۡتَقِيۡمَ (٥)	صِرَاطَ	الَّذِيۡنَ	نَسۡتَعِيۡنُ	تعاون، معاونت، معاون
ہم مدد چاہتے ہیں	ہدایت دے ہمیں	راستہ	سیدھا	راستہ	ان لوگوں کا	اِهۡدِنَا	ہدایت، ہادی، مہدی
ہیں اور ہم صرف تیری ہی مدد چاہتے ہیں ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے۔						الۡمُسۡتَقِيۡمَ	خط مستقیم، قائم، قیامت، قوم

اَنۡعَمۡتَ	عَلَيۡهِمۡ	غَيۡرِ	الۡمَغۡضُوۡبِ	عَلَيۡهِمۡ	وَلَا	الضَّآلِّيۡنَ (٧)	اَنۡعَمۡتَ	نعمت، انعام، منعم، نعیم
انعام کیا تو نے	ان پر	نہ	غضب ہوا	ان پر	اور نہ	گمراہوں	الۡمَغۡضُوۡبِ	غضبناک، غیظ و غضب
راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ ان کا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔								

اہم نکات

مشکل الفاظ کے معانی

١۔ 'اَلۡ' الگ لفظ ہے جو اسم کے حروف اصلیہ کا حصہ نہیں ہوتا جیسے ہم انگریزی میں عموماً The استعمال کرتے ہیں مثلاً اَلرَّحۡمٰنُ دراصل اَلۡ + رَحۡمٰنُ ہے اور اَلرَّحِيۡمُ دراصل اَلۡ + رَحِيۡمُ ہے۔

٢۔ عربی زبان میں بعض اوقات الفاظ کو ایک دوسرے سے ملا کر اور جوڑ کر لکھا جاتا ہے۔ جیسے بِسۡمِ اللّٰهِ میں بِسۡمِ اصل میں بِ + اِسۡمِ تھا اور اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ میں لِلّٰهِ دراصل لِ + اللّٰهِ اور اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ میں عَلَيۡهِمۡ دراصل عَلٰى + هِمۡ تھا۔

بقیہ آخری صفحہ پر ←

٣۔ 'الله' اسم ذات ہے اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، صفاتی اسماء کے ترجمے کیے جاتے ہیں جیسے کَرِیْمٌ کا مطلب کرم فرمانے والا، حَلِیْمٌ بُردبار۔
مفہوم عربی میں بہت وسیع ہے اس لیے اس کا ترجمہ عموماً نہیں کیا جاتا۔ اردو میں بعض لوگ اس کا ترجمہ 'خدا' سے کرتے ہیں۔
٤۔ اَلْحَمْدُ میں تعریف اور شکر دونوں شامل ہوتے ہیں۔
٥۔ رَبّ کے معنی عربی میں بہت وسیع ہیں۔ اردو ترجمے میں صرف ایک لفظ لانے کی مجبوری کے تحت اس کا ترجمہ پروردگار کیا جاتا ہے۔
٦۔ یَوْمِ الدِّیْنِ: دین کے وسیع معانی میں سے ایک معنی جزا اور بدلے کے ہوتے ہیں۔ مطلب ہے قیامت اور حشر کا دن جب بندوں کا حساب ہوگا اور ان کے اچھے یا برے اعمال کی جزا و سزا انہیں ملے گی۔
٧۔ نَعْبُدُ: عربی میں عبادت کا مفہوم بھی وسیع ہے جس میں پرستش اور اطاعت کی ساری قسمیں شامل ہیں۔
٨۔ مَغْضُوْبِ: مفعول ہے لیکن اردو ترجمہ میں اسے مفعول لایا نہیں جا سکتا۔

مفہوم کا خلاصہ

١۔ سورۃ الفاتحہ میں اللہ سے دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے یعنی پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرو پھر دعا مانگو۔
٢۔ اس سورت کے مضامین کے تین حصے ہیں پہلے حصے میں توحید اور اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے مستحق تعریف و شکر ہونے کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں بندے کی طرف سے صرف اللہ کی عبادت و اطاعت اور استعانت (مدد مانگنے) کا وعدہ ہے اور تیسرے حصے میں بندہ اللہ سے ہدایت کی دعا کرتا ہے۔
٣۔ اس سورت میں قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات یعنی توحید، رسالت اور آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ شروع میں توحید کا ذکر ہے اور یَوْمِ الدِّیْنِ میں آخرت کا اور اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں رسولوں کی طرف اشارہ ہے۔
٤۔ عربی زبان میں ہر لفظ کا ایک مادہ ہوتا ہے جو حروف اصلیہ پر مبنی ہوتا ہے اور جس سے کئی الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں لیکن اصلی حروف باقی رہتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کے مادے کا پتہ چل جائے تو اس کے معنی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عربی مادہ معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس لفظ سے ملتے جلتے الفاظ کے حروف لکھ لیے جائیں جو حروف ان سب میں مشترک ہوں وہ رہنے دیے جائیں اور باقی حروف کاٹ دیے جائیں تو جو حروف باقی رہ جائیں گے وہ حروف اصلیہ یا مادہ ہوں گے۔ مثلاً

الحمد: ال ح م د　　حامد: ح ا م د　　محمود: م ح م و د　　محمد: م ح م م د

ان سب الفاظ میں ''ح م د'' مشترک حروف ہیں لہٰذا وہی ان الفاظ کا مادہ ہیں۔

حاصل کردہ سبق

١۔ ہر کام کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کرنا چاہیے۔
٢۔ دعاء مانگنی چاہیے اور دعاء صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے۔ اور جو بھی چھوٹی بڑی ضرورت ہو اللہ ہی سے مانگنی چاہیے۔
٣۔ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور صرف اسی سے مدد مانگو۔

ماہنامہ
البرہان
لاہور
Since 2010

جلد ۲۸ — شمارہ ۲

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

فروری ۲۰۲۴ء/رجب المرجب ۱۴۴۵ھ

آئینہ مضامین

فکرونظر

غزہ: کیا پتھر بارشوں کے مستحق ہیں ہم؟ — ڈاکٹر سیف اللہ فیضی — ۴

تعلیم وتربیت

۔ قرآن سے کھلواڑ — مدیر — ۵

۔'دوڑو دنیا کی طرف': کیا جامعۃ الرشید کے مفتی عبدالرحیم صاحب کا مؤقف مناسب ہے؟ — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۸

فکرودانش

عصرِ حاضر میں احیائے اسلام: اصل چیلنج علمی وفکری ہے — ڈاکٹر اسعد زمان — ۱۹

تفہیم دین

۔قرآن حکیم کو محض سیاسی انقلاب کا علمبردار سمجھنے کی نفسیات اور اس کے مخدوش اثرات — حافظ موسیٰ بھٹو — ۲۳

۔جماعت اسلامی کی قیادت کو فکرمندی کی ضرورت — مدیر — ۳۱

۔متجددین کی نشانیاں اور اقسام — ۳۳

اسلام اور پاکستان

۔ پاکستان میں احیائے اسلام کی عملی جدوجہد: دینی جماعتوں خصوصاً ڈاکٹر ابصار احمد اور ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی توجہ کے لیے — ڈاکٹر محمد امین — ۳۵

۔ دینی جماعتیں اور انتخابات ۲۰۲۴ء — ۴۷

۔ کیا فوج کا تربیتی نظام استعمار کی وراثت پر مبنی ہے؟ — قاضی حسین احمد — ۴۸

تفہیم مغرب

مغرب کے خلاف انقلاب ممکن نہیں — مکرم محمود — ۵۳

عالم اسلام/فلسطین

جہادِ فلسطین کامیابی کی منازل طے کررہا ہے — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۷۳

اشاریہ: اشاریہ 'البرہان' ۲۰۲۳ء — ادارہ — ۷۷

English Section

American Terrorism — Dr. Javed Akbar Ansari — ۸۲

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِاعانت: فی شمارہ 85روپے
سالانہ 1000روپے۔ پانچ سال: 5000روپے
تاحیات 20,000روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

ڈاکٹر سیف اللہ فیضی [1]

غزہ
کیا پتھر بارشوں کے مستحق ہیں ہم؟

ذرا ٹھہرو!
بڑا غمناک ہے جملہ
ہاں!
یہ صبحیں اور شامیں سب دلیلیں ہیں
وہ آنکھیں سب دلیلیں ہیں
کسی شب میں
کوئی کروٹ
یہ پہلو اور کروٹ سب دلیلیں ہیں
وہ راتیں سب دلیلیں ہیں
یہ بچے، عورتیں، بوڑھے
غزہ پر اِک قیامت ہے
تمھارے دل کی نرمی اب کہاں ہے؟
تمہارے دِل دلیلیں ہیں
غزہ پر اک قیامت ہے
وہ اسلامی اخوت کی
قیامت بے حسی ہو جب
تمہارے دل دلیلیں ہیں

تمھیں جھٹکا لگا ہوگا
پتھر بارشوں کے مستحق ہیں ہم؟
پتھر بارشوں کے مستحق ہیں ہم
وہ آنکھیں جِن سے اِک آنسو نہیں نِکلا
اگر ہے تو دکھاؤ ناں!
کوئی پہلو
جو اُن کے غم میں بدلی ہو
بَسر جو چَین سے کی ہیں
یہ لاشے، ہر طرف بکھرے ہوئے لاشے
یہ چہرے اور سَر بازو
بڑے ہو نرم دل کے تُم
کیا پتھر دل نہیں ہو تم؟
پتھر بارشوں کے مستحق ہو تُم
نصرت اور ہجرت کی
روایت اب کہاں ہے؟
قیامت ٹوٹ پڑتی ہے
پتھر بارشوں کے منتظر ہو تم!

---

[1] صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، سول لائنز کالج، لاہور

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

قرآن سے کھلواڑ

* اُردو بازار لاہور کے پبلشرز یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ پرائمری کے طلبہ کے لیے پارے/ سپارے طبع کروائے جو اس نے یہ کہہ کر چھپوانے بند کر دیئے ہیں کہ ان کے پاس فنڈز کی کمی ہے۔

* پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کا قرآن حکیم کے ترجمہ کی تدریس کا نصاب انتہائی ناقص ہے۔ اس نے ہر جماعت میں چھ سات پارے لگا دیے ہیں لیکن اعلان کر دیا ہے کہ ان کا امتحان نہیں ہوگا بلکہ امتحان کے لیے چند متفرق آیات مختص کر دی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان چند آیات پر مبنی خلاصے چھپ کر بازار میں آ گئے ہیں۔ طلبہ ان کا رٹّہ لگا کر امتحان دے لیتے ہیں اور پورے پارے نہ کوئی پڑھتا ہے، نہ پڑھاتا ہے۔ یہ خصوصاً نویں دسویں جماعت میں ہے جہاں بورڈ کا امتحان ہوتا ہے۔

* چھٹی سے لے کر آٹھویں تک چونکہ امتحان بورڈ نہیں لیتا بلکہ سکول لیتا ہے لہٰذا اکثر سکولوں نے ان جماعتوں میں ترجمۂ قرآن پڑھانا بند کر دیا ہے۔

* ہمیں کئی طلبہ نے بتایا ہے کہ ترجمۂ قرآن پڑھانے کے لیے خصوصی اساتذہ موجود نہیں ہیں اور اسلامیات لازمی کے اساتذہ کو یہ اضافی کام دے دیا گیا ہے (حالانکہ لاہور ہائی کورٹ نے ایک سے زیادہ دفعہ پنجاب حکومت کو حکم دیا کہ ترجمۂ قرآن کے لیے اساتذہ بھرتی کیے جائیں) جو عموماً کلاس میں آ کر کہتے ہیں کہ کتاب کے فلاں صفحے کے پیرا دو اور تین کا ترجمہ یاد کر لیں اور بس۔ یعنی قرآن کا ترجمہ پڑھانے سکھانے کے لیے اکثر اساتذہ کوئی محنت کرتے ہی نہیں۔

* اسلام آباد سے ہمیں معروف اسلامی مصنفہ اور کالم نگار باجی عامرہ احسان نے فون پر بتایا کہ ان کی ایک عزیزہ کے ہاں اے لیول کی ایک بچی اسلامک سٹڈیز پڑھنے آئی اور معاشرت سے متعلق آیات پڑھ کر کہنے لگی کہ قرآن کیسی کتاب ہے جو کہتی ہے کہ مرد عورت پر

حاکم ہے اور اسے اس کو مارنے کی بھی اجازت ہے جبکہ عورت ومرد میں تو مساوات ہونی چاہیے۔ باجی پریشان تھیں کہ قرآنی تعلیمات کے حوالے سے نوجوان بچیوں کی ذہن سازی کی ضرورت ہے جبکہ اساتذہ اس طرف توجہ ہی نہیں دے رہے۔ جبکہ چند ماہ پیشتر بنوں میں عوام اور علماء ایک ایسے پروفیسر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے جو قرآن کی ان آیات کے خلاف کلاس میں لیکچر دیتا تھا اور ان کا مضحکہ اڑاتا تھا۔

* قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد اور کامسیٹ یونیورسٹی نے اپنے کیمپسز میں فنڈز کی کمی کا بہانہ بنا کر قرآن اور اسلامیات کی تدریس کے لیے اساتذہ کی چھٹی کرادی ہے اور فزیکل کلاسیں لینا بند کردی ہیں اور لیکچر ریکارڈ کر کے طلبہ کو آن لائن پڑھانا شروع کر دیا ہے۔

* پنجاب کے سابق گورنر چوہدری غلام سرور صاحب نے یونیورسٹی میں انڈر گریجوایٹس کے لیے ایک کریڈٹ آور سالانہ لازمی قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سال میں دو سمسٹر ہوتے ہیں اور صرف ایک سمسٹر میں ہر ہفتے میں ایک گھنٹے کی ترجمۂ قرآن کلاس ہوا کرے گی۔ ظاہر ہے اتنا کم نصاب اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مترادف ہے اور اس کا کوئی اثر طلبہ کی سیرت وکردار پر نہیں پڑے گا۔

ہمارا مطالبہ

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ:

- حکومت سکولوں میں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک ترجمۂ قرآن کلاسوں کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرے۔

- حکومت/ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ اپنا نصاب بدلے اور چند آیات کی بجائے کم از کم ایک پارہ کی تدریس ہر سال لازمی قرار دے اور اس کا امتحان لے تاکہ سکول اساتذہ اس پارے کی تدریس میں عملاً دلچسپی لیں۔ نیز بورڈ نصاب میں قرآن حکیم کی مسنون اور امت میں معمول بہ توقیفی ترتیب کو ملحوظ رکھے اور اپنی خودساختہ ترتیب سے ترجمۂ قرآن نہ پڑھائے۔

- اساتذہ ترجمۂ قرآن میں دلچسپی لیں اور طلبہ سے رٹہ لگوانے کی بجائے انہیں ترجمہ کرنے کا ڈھنگ سکھائیں۔

- یونیورسٹیوں میں کم از کم فی سمسٹر ڈیڑھ کریڈٹ آور کی ترجمۂ قرآن کلاس ہو تا کہ طلبہ کے کچھ پلے بھی پڑے۔

- یونیورسٹیوں کو ترجمۂ قرآن اور اسلامک سٹڈیز کی آن لائن کلاسوں سے روک دیا جائے اور یونیورسٹی میں فزیکل کلاس لینا ضروری قرار دیا جائے۔

خصوصی آفر

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ نے طلبہ وطالبات کو ترجمۂ قرآن سکھانے کا ایک منفرد اور دلچسپ طریقہ ڈویلپ کیا ہے جس سے ایک پارہ کا ترجمہ سیکھ لینے سے باقی سارے قرآنی متن کا تقریباً ستر فیصد سمجھ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پیکیج طبع شدہ موجود ہے اور برائے نام قیمت پر مہیا کیا جا سکتا ہے۔ ہم ملک بھر کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے تیار کردہ ''تدریس القرآن'' کے پاروں کو اپنے ہاں لگوائیں تا کہ طلبہ آسانی سے قرآن حکیم کے ترجمہ اور مفہوم کو سمجھ کر اپنی زندگیوں کو بدل سکیں۔

شریعت اور مخلوط تعلیم

حضرت جنید بغدادیؒ سے پوچھا گیا کیا کوئی مرد کسی غیر محرم لڑکی کو پڑھا سکتا ہے؟ فرمایا: اگر پڑھانے والا بایزید بسطامیؒ ہو، اور پڑھنے والی رابعہ بصریؒ ہو، جس جگہ پڑھا یا جا رہا ہو وہ بیت اللہ ہو، اور جو کچھ پڑھا یا جا رہا ہو وہ کلام اللہ ہو، پھر بھی اجازت نہیں ہے۔

دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ متوجہ ہوں

اب اپنی عامہ، خاصہ، عالیہ کی ڈگری کو بالترتیب میٹرک، انٹر اور بی اے کے مساوی کریں۔ اوپن یونیورسٹی سے ۶ ماہ کا کورس کریں اور اپنی دینی تعلیم کو دنیاوی تعلیم کے برابر لائیں اور بہتر روزگار پائیں۔ ثانویہ عامہ اور خاصہ کے داخلے ۱۵ جنوری سے اور شہادۃ العالیہ کے یکم مارچ سے شروع ہو رہے ہیں۔

تزکیۂ نفس

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

'دوڑو دنیا کی طرف'

کیا جامعۃ الرشید کے مفتی عبدالرحیم صاحب کا مؤقف مناسب ہے؟
مفتی صاحب کے مؤقف کے بارے میں چند اشکالات

جامعۃ الرشید کراچی کے مفتی عبدالرحیم صاحب دین کے عالم اور ایک بڑے آدمی ہیں۔ ان سطور کا راقم آثم پچھلے پینتیس سال سے تعلیم خصوصاً دینی مدارس میں جس اصلاح کا علمبر دار رہا ہے، اس پر دینی مدارس میں عمل کرنے والے وہ پہلے آدمی ہیں اور اس لحاظ سے وہ میرے پسندیدہ عالم ہیں (گو مجھے آج تک ان سے ملنے یا جامعہ کے پروگراموں کو عملاً دیکھنے کا موقع نہیں ملا کہ یہ تیقن ہوتا کہ وہاں دینی و دنیاوی تعلیم کی ثنویت کے خاتمے کے لیے اس کے صحیح تقاضوں پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں)۔ چند ہفتے پہلے کراچی میں ایک ہوٹل کی سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کے موقع پر انہوں نے جو تقریر فرمائی اور ان کے عملے نے اس کے اوپر بطور ٹائٹل جو کلرڈ گراف بنایا، وہ قاری کی توجہ کھینچتا تھا اور اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ عشرہ مبشرہ میں سے چھ (۶) صحابی ارب پتی تھے اور ان کے پاس ٹنوں کے حساب سے سونا تھا۔ مطلب یہ کہ آج کے مسلمانوں کو بھی دولت کمانے سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں ہوٹل قائم کرنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ہوٹل کو دنیا کا بہترین ہوٹل بنائیں اور کفار کی طرح ساری دنیا میں اپنے برانڈ کی شاخیں کھولیں۔ لوگوں کو ملازمتیں دینا تو خیر کا کام ہے۔

مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں تین باتیں مزید فرمائیں جن کا یہ خاکسار عرصہ سے علمبر دار ہے (اور اس کے لیے پندرہ بیس کتابیں لکھ چکا ہے اور اپنے ماہنامہ 'البرہان' میں بھی ان پر مسلسل لکھتا رہتا ہے) وہ یہ کہ: ۱۔ حکام اور علماء میں تفریق اور ثنویت صحیح نہیں ہے۔ ۲۔ دین و دنیا میں تفریق اور ثنویت غلط ہے۔ ۳۔ دینی و عصری علوم میں تفریق اور ثنویت نہیں ہونی چاہیے۔ اور سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ وہ اپنی دینی جامعہ (اور یونیورسٹی) میں ان امور پر عمل کر کے دکھا رہے ہیں جس کا خواب مَیں برسوں سے دیکھ رہا ہوں

لہٰذا اس لحاظ سے وہ میری پسندیدہ شخصیت ہیں اور مَیں ان کی خرد افروزی اور علو ہمت کی داد دیتا ہوں اور ان کے کاموں کی تکمیل کے لیے دعا گو ہوں۔ ان کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ حکومت بری نہیں، حکومت کی حرص بری ہوتی ہے اور یہ کہ اعمالِ اطاعت و معاملات (بشمول کسبِ رزق کی جدوجہد) اگر اسلامی تعلیمات اور مقاصد کے مطابق ہوں تو ایک لحاظ سے عبادت ہی ہیں۔

بایں ہمہ اور مفتی صاحب کی اس مدح کے باوصف مجھے مفتی صاحب کی اس تقریر سے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ بحیثیت ایک عالم اور مربی کے مسلمانوں کو یہ دعوت دے رہے ہیں کہ ’دوڑو دنیا کی طرف‘ اچھی نہیں لگی۔ اور جس طرح مفتی صاحب رائج دینی نظامِ تعلیم کے خلاف تنہا اور پہلی آواز بن کر اٹھے ہیں، مَیں بھی بحیثیت ایک طالب علم ان کے اس مؤقف کے خلاف اپنے اشکالات پیش کر رہا ہوں، اس توقع سے کہ وہ ان اشکالات کو رفع کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔[۱]

۱۔ مسلمانوں کا یہ متفق علیہ دینی عقیدہ ہے کہ آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح حاصل ہے۔ قرآن حکیم نے کئی دفعہ دنیا کی زندگی کی تحقیر اور مذمت کی ہے[۲] صرف ایک آیت پیش خدمت ہے: ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ [العنکبوت ۲۹: ۶۴] اگرچہ یہ بھی فرمایا کہ: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ....﴾ [الاعراف ۷: ۳۲] اور ﴿ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا....﴾ [القصص ۲۸: ۷۷]

تاہم قرآن کی تشریح کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سب پر مہیمن ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل مبارک یہ تھا کہ آپ کے گھر میں دو دو ماہ چولہا نہیں جلتا تھا[۳]۔ آپ مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے سے کچے گھر میں رہتے تھے۔ آپ یہودیوں سے

---

[۱] ’البرہان‘ عرصے سے ان کو جا رہا ہے تاہم میرے علم میں نہیں کہ انہیں اپنی قیمتی مصروفیات میں سے کچھ لمحے نکال کر اسے دیکھنے کا موقع ملتا ہے یا نہیں؟

[۲] الانعام ۶: ۲۳، الکہف ۱۸: ۷، طٰہٰ ۲۰: ۱۳۱ وغیرہ

[۳] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۴۵۹

قرض لیتے رہتے تھے[۱] اور جب کھری چارپائی پر لیٹنے سے آپ کے جسم مبارک پر نشان پڑ گئے اور حضرت عمرؓ نے اس پر آبدیدہ ہو کر قیصر وکسریٰ کی سہولتوں کی طرف اشارہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ان کے لیے دنیا ہے اور ہمارے لیے آخرت[۲]۔ آپ کی سادگی، فقر اور زہد اسلام میں اور مسلمانوں میں معروف ہے۔ اور آپ نے ان اقدار وصفات کو نہ صرف اپنایا بلکہ ان کی تعلیم بھی دی۔ حدیث کی معتبر کتابوں میں زہد اور رقاق کے ابواب ان تعلیمات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم چند احادیث کی طرف اشارہ بطورِ مثال کیے دیتے ہیں۔ فرمایا:

* دنیا مردار سے بدتر اور حقیر ہے اس کے خریدار نہ بنو۔[۳]

* آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ "اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو تمہارے لیے اتنی دنیا کافی ہونی چاہیے جتنا سامان کسی مسافر کے پاس ہوتا ہے۔ خبردار! دنیا کے طلب گار مال داروں کے پاس مت بیٹھنا۔ اگر کپڑا پرانا ہو جائے تو اتار پھینکنے کی بجائے پیوند لگا کر پہننا۔[۴]

* آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جو شخص دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو تباہ کرے گا اور جس شخص کو اپنی آخرت محبوب ہوگی تو وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا۔ تو اے لوگو! تم باقی رہنے والی زندگی کو فنا ہونے والی زندگی پر ترجیح ہو۔[۵]

* نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کا نتیجہ: فقر وفاقہ: ایک صحابیؓ نے آپ سے کہا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو فقر وفاقہ کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے فقر وفاقہ اس کو اس طرح آ لیتے ہیں جیسے اونچی جگہ

---

[۱] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۰۹

[۲] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، رقم الحدیث: ۴۹۱۳

[۳] صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقاق، رقم الحدیث: ۲۹۲۱

[۴] سنن ترمذی، ابواب اللباس، رقم الحدیث: ۱۷۸۰

[۵] مستدرک حاکم، کتاب الرقاق، رقم الحدیث: ۷۹۲۳، ۳۲۶۱

سے نیچے کو بہنے والا پانی۔ (۱)

* امام ابوحنیفہؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ عقل مند وہ ہے جو دنیا کو سب سے زیادہ چھوڑنے والا ہو۔ (۲)

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ زہد وتقویٰ کی اس طرح کی بے شمار احادیث معتبر مجموعہ ہائے حدیث میں موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ احادیث محض پڑھنے کے لیے ہیں یا ان پر عمل بھی ضروری ہے؟

یاد رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے (۳) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے مبعوث کیا ہی اس لیے تھا کہ لوگ آپ کی زندگی کے ماڈل کو دیکھ کر اس کی پیروی کریں (۴) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع پر ہی مسلمانوں کی دنیا وآخرت میں کامیابی کا انحصار ہے (۵) اگر کوئی کہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زہد، سادگی اور فقر پر عمل آپ کا ذاتی اختصاص تھا اور امت کے لیے اسوہ نہ تھا تو اس کے لیے دلیل درکار ہے۔ ہم اگر فرض کریں کہ یہ آپ کا ذاتی اختصاص تھا تو بھی سوچنے کی بات یہ ہے کہ آپ جیسی عظیم المرتبت ہستی نے اس کو کیوں اختیار کیا اور وہ قابلِ تقلید ہے یا نہیں؟

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش ایک غریب گھرانے میں ہوئی (حضرت ابوطالب کی مالی حالت کمزور تھی) (۶) عرب معاشرے میں غربت بھی موجود تھی خصوصاً غلاموں کی حالت بہت پتلی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ پر ایمان لانے والے اکثر غلام اور پسے ہوئے لوگ تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کی اور عوام کی معاشی بہتری کے لیے کوئی

---

(۱) سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۳۳۵۰

(۲) اخرجہ الخوازمی فی جامع المسانید لامام ابی حنیفہ، ج ۱، ص ۱۹۹

(۳) الاحزاب ۳۳: ۲۱

(۴) النساء ۴: ۶۴

(۵) الاحزاب ۳۳: ۷۱

(۶) تاریخ ابن کثیر

پانچ یا دس سالہ معاشی منصوبہ پیش نہ کیا بلکہ اپنی دعوت کا آغاز توحید، رسالت اور آخرت سے کیا۔مکی دور کی سورتوں کو دیکھیے وہ اکثر انہی عقائد پر ترکیز کرتی ہیں۔اگر چہ حضرت عمرؓ کے دور میں فتوحات کی وجہ سے دولت کی ریل پیل ہوگئی تھی لیکن حضرت عمرؓ اس پر خوش ہونے کی بجائے روتے تھے[۱] اور اسے نعمت سمجھنے کی بجائے مسلمانوں کے لیے فتنہ اور آزمائش سمجھتے تھے۔خود انہوں نے نبی کریم ﷺ جیسی سادہ اور زہد کی زندگی ہی اختیار کی۔

۳۔ صدرِ اوّل میں دولت کی ریل پیل، آسائشوں کی کثرت (نیز غیر مسلموں کے کثرت سے اسلام لانے اور ان سب کی اسلامی تعلیمات کے مطابق کما حقہ تربیت نہ ہو سکنے) کی وجہ سے مسلمانوں میں اخلاقی خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔عبادات اور زہد و تقویٰ کا معیار گر گیا۔آخرت کی فکر اور اللہ کے حضور پیش ہونے کے ڈر میں کمی واقع ہونا شروع ہوئی تو امت کے علماء و صلحاء کو فکر ہوئی اور کبار تابعین میں سے حضرت حسن بصریؒ اور حضرت ثابت بنانیؒ وغیرہ نے تزکیۂ نفس، فکرِ آخرت اور تقرب الی اللہ کی تحریک شروع کی۔بعد میں اس تحریک نے تصوف کا نام اختیار کر لیا اور خانقاہی نظام وجود میں آیا۔اس نظامِ تربیت و تزکیہ کو چلانے والے علماء و صلحاء تھے۔خلاصہ یہ کہ کثرتِ دولت اور حبِّ دنیا و مال فتنہ اور وبال ہیں جن کے استیصال کے لیے امت کے علماء و صلحاء نے ہمیشہ جدوجہد کی۔

۴۔ مسلمانوں کے عروج کا سبب کیا تھا؟ دولت کی کثرت، بڑی فوج، عمدہ اسلحے کی فراوانی؟ ہرگز نہیں! صرف مسلمانوں کا اسلام پر عمل، ایمان اور عملِ صالح اور جذبۂ جہاد بقول اقبال ؎

مَیں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

مسلمانوں کے زوال کا سبب کیا تھا؟ کیا دولت کی کمی اور دنیاوی سہولتوں کی عدم موجودگی؟ ہرگز نہیں! اس کی وجہ تھی ایمان اور عملِ صالح میں کمی جس کا سبب تھا تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے نظام کی خرابیاں۔اقبال کہتا ہے ؎

---

[۱] البیہقی، ج ۶، ص ۳۵۸

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری!

یعنی ان کے نزدیک زوال کا سبب تھا علماء کرام کا صحیح منہج پر تدریس واجتہاد کے شعبوں میں کمزوری، صوفیائے عظام کا تزکیۂ نفس (تعمیرِ سیرت وکردار) کا کام صحیح اسلامی خطوط پر نہ کرنا اور سیاسی عدم استحکام۔ انہوں نے یہ بھی کہا۔

سبب کچھ اور ہے، تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

مسلمانوں کے عروج کا طریقہ کیا ہے؟ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ یعنی اصلاح وترقی کا وہی فارمولا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کو دیا تھا۔ قرآن حکیم میں چار جگہ اس کا ذکر ہے[۱] اور امام دار الہجرہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ اس قوم کے آخر کی اصلاح بھی اسی طرح ہوگی جس طرح صدرِ اوّل میں ہوئی تھی۔ یعنی تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس سے، نہ کہ مال ودولتِ دنیا کی کثرت اور اسبابِ دنیا کی فراہمی سے۔

بہت سے ناپختہ ذہن کے لوگ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی برتری کی وجہ مال ودولت، اسبابِ دنیا کی کثرت اور سائنس وٹیکنالوجی ہے حالانکہ یہ ترقی کے مظاہر اور اس کا نتیجہ ہیں۔ ان کے غلبے اور برتری کی اصل وجہ ان کی ان کے نظریۂ حیات سے شدید وابستگی ہے اور مسلمانوں کے عروج کا سبب بھی یہی تھا۔ مسلمانوں نے کل بھی اسے غزوۂ بدر وقادسیہ میں ثابت کیا تھا اور آج بھی افغان مجاہدین نے اسے افغانستان میں ثابت کر دکھایا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گُلستاں پیدا

ہم نے اس موضوع کی وضاحت کے لیے ’مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحۂ عمل‘ کے عنوان سے ۴۰۸ صفحات کی کتاب لکھی ہے۔

۵۔ مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں عشرہ مبشرہ میں سے چھ صحابہ کو ارب پتی قرار دیا

---

[۱] البقرہ ۲: ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

اور ہر صحابی کے ٹنوں سونے کا ذکر کیا ہے۔ لطف یہ کہ آپ نے چھ صحابہ کا ذکر کیا ہے لیکن جدول میں تفصیل صرف تین صحابہ کی دی ہے جو یوں ہے:

عشرہ مبشرہ میں ۶ اَرب پتی صحابہ!

* حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کی وراثت میں ۱۶ ٹن سونا تھا
* حضرت سعید بن زیدؓ کے پاس تین سو اونٹ سونے کے تھے
* حضرت سعید بن زیدؓ کے پاس ایک لاکھ ۵۰ ہزار کلو سونا تھا
* حضرت زبیرؓ کی وراثت چھ کروڑ درہم تھی
* حضرت عثمانؓ نے صرف ایک بار ۱۹۵۰ اونٹ سامان سے لدے اللہ کے راستے میں دیے

اس گراف سے ظاہر ہے کہ حضرت سعید بن زیدؓ کا نام دو دفعہ لکھ دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ حضرت سعید بن زیدؓ کی امارت کے بارے میں ہمیں، سرسری طور پر دیکھنے میں، کوئی حدیث نہیں ملی۔ یہ بھی یاد رہے کہ صحابہ کی تعداد محدث ابوزرعہؒ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱،۲۴،۰۰۰) تک بتائی ہے۔ بعضوں نے اس سے کم کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ان کی تعداد علماء نے ایک سو تک بتائی ہے۔ بدر کے ۳۱۳ صحابہ اور بیتِ رضوان کرنے والے صحابہ کی تعداد ۱۴۰۰ اِس میں شامل نہیں۔ اب تصور کیجیے کہ اگر صحابہ کرام کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہو (حجۃ الوداع میں ۴۰ ہزار بتائی جاتی ہے) جن میں سے ایک سو کے قریب مبشرین بالجنہ ہوں تو ان میں سے تین آدمیوں کا امیر ہونا کیا وزن رکھتا ہے؟ اور وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اس وقت جب قیصر و کسریٰ کی شکست کے بعد کثیر تعداد میں مالِ غنیمت حجاز اور مدینہ منورہ پہنچا اور تجارتی سرگرمیوں کا حجم بہت بڑھ گیا۔

پھر جن لوگوں کی امارت کا مفتی صاحب نے ذکر کیا ہے۔ ان کی حالت پر بھی غور کرنا چاہیے۔ وہ عام آدمی کی طرح رہتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایک دفعہ روزہ افطار کرنے لگے تو ان کے سامنے عمدہ کھانا پیش کیا گیا تو رو پڑے اور فرمایا مصعب بن عمیرؓ مجھ سے بہتر تھے اور مکہ میں بہت خوش حال تھے لیکن جب وہ بدر میں شہید ہوئے تو کفن کا پورا کپڑا میسر نہ تھا چنانچہ پاؤں پر گھاس ڈال دی گئی۔ حضرت حمزہؓ مجھ سے بہتر تھے لیکن وہ کس طرح شہید کیے گئے۔ یہ کہہ کر اتنا روئے کہ کھانا نہ کھا سکے [۱]۔ ایک دفعہ اچھا کھانا پیش کیا گیا تو

[۱] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۲۷۵

فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہلِ بیت نے زندگی میں کبھی پیٹ بھر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی۔ہم پر دنیا وسیع کردی گئی ہے تو کیا وہ اس سے بہتر ہے اور اس پر کافی دیر روتے رہے [۱] ایک دفعہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ میرا مال مجھے تباہ کردے گا، مَیں کیا کروں؟ [۲] حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے کہ غریب صحابہ ہم سے بہتر ہیں جو اپنی غربت کے باوجود خرچ کرتے ہیں جب کہ ہم اپنے منافع میں سے خرچ کرتے ہیں [۳] حضرت زبیر بن عوام کی حالت یہ تھی کہ جب شہید ہوئے تو ۲۲ لاکھ درہم کے مقروض تھے اور انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ (بن زبیرؓ) کو وصیت کی کہ میری جائیداد منقولہ بیچ کر میرا قرض ادا کردینا۔

پھر اونٹوں کی تعداد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن سونے کی مقدار کلوگرام اور ٹنوں میں اور کرنسی کی تعداد کروڑوں اور اربوں میں متعین اور محدود انداز میں کیسے وجود میں آ گئی جبکہ یہ سب عصر حاضر کے مقدار اور تعداد کے جدید پیمانے ہیں اور پہلے مستعمل ہی نہ تھے۔کم از کم ساتھ الفاظ ''اندازاً'' یا ''تقریباً'' ہی لکھ دیا جاتا۔قبلہ مفتی صاحب نے یہ بھی نہیں بتایا کہ ان کی معلومات کے مآخذ کیا ہیں؟ اپنی تقریر میں انہوں نے صرف حضرت زبیر بن عوامؓ کی امارت کا صحیح بخاری کے حوالے سے ذکر کیا ہے لیکن باقی صحابہ کی کوئی تفصیل نہیں دی۔بعض عربی مضامین میں اس کی تفصیل طبقات ابن سعد، تاریخ مسعودی اور تاریخ ابن کثیر کے حوالے سے ملتی ہے لیکن لکھنے والوں کا اسلوب ایسا لگتا ہے جیسے وہ رافضی ہوں۔ واقدی اور ابن سعد پر وضع حدیث کا اتہام امام احمد بن حنبلؒ اور امام یحییٰ بن معین جیسے محدثین کا موجود ہے [۴] اور تاریخ کی کتابوں کے بارے میں ظاہر ہے کہ انہیں وہ استناد میسر نہیں جو معتبر کتبِ حدیث کا خاصہ ہے۔اگر قبلہ مفتی صاحب اس تقریر کی اشاعت سے پہلے معتبر حوالہ جات دیکھ لیتے اور ان کا ذکر فرما دیتے تو ان کی بات میں وزن پیدا ہو جاتا۔

مجھے مفتی صاحب کے زہد وتقویٰ پر شک نہیں تاہم مالداری کی ایسی تحسین سے دینی طبقہ میں بھی حُبّ مال اور طولِ امل کی دوڑ لگ جائے گی جو اسلام کو مطلوب نہیں بلکہ مغرب کی

---

[۱] شمائل ترمذی، رقم الحدیث: ۳۷۸

[۲] مسند احمد، ج ۶، ص ۳۱۷، تحقیق شعیب الارنووط

[۳] امام غزالی، احیاء علوم الدین

[۴] ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات سیرت

ترجیحات میں سرفہرست ہے۔ ﴿اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ﴾

۵۔ پچھلی چودہ صدیوں میں مسلمان علماء وصلحاء کا کردار کیا رہا ہے؟ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اتباع میں) توحید و رسالت اور آخرت کی دعوت دی ہے۔ انہیں آخرت یاد دلائی ہے، انہیں اللہ کے لیے اخلاص کی تلقین کی ہے۔ انہیں اسلامی تعلیمات پر عمل کی ترغیب دی ہے۔ انہیں استغفار اور کثرت ذکر کی دعوت دی ہے۔ انہوں نے کبھی مسلمانوں کو دنیا کمانے اور امیر بننے کی دعوت نہیں دی۔ انہوں نے کبھی مسلمانوں کو یہ نہیں کہا کہ مال ودولتِ دنیا میں کفار سے بڑھ جاؤ۔ معاف کیجیے گا یہ کام تو شیطان بخوبی کر رہا ہے۔ وہ مومنوں کو دنیا کی محبت اور مال و دولت کی محبت پر اکساتا ہے، انہیں اسبابِ دنیا کی ترغیب دلاتا ہے، تو یہ کام تو شیطان کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ قرآن حکیم نے نہ صرف مسلمانوں کو ﴿اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ①﴾ [التکاثر ۱:۱۰۲] سے متنبہ کیا ہے بلکہ مال ودولت کو فتنہ قرار دیا ہے۔[۱] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حصول دنیا کی سرگرمیوں کی کثرت سے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کیونکہ اس کثرت کا لازمی نتیجہ حب دنیا ہے جو ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ اس سلسلے میں دو احادیث پیش خدمت ہیں:

* وعن ابن عمر رضي الله عنهما قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: »إذا تبايعتم بالعينة، وأخذتم أذناب البقر، ورضيتم بالزرع، وتركتم الجهاد، سلط الله عليكم ذلا لا ينزعه شيء حتى ترجعوا إلى دينكم۔[۲]

* لا يزال قلب الكبير شابًا في اثنين في حب الدنيا وطول الامل۔[۳]

اسی طرح مغرب کی الحادی فکر وتہذیب بھی مسلمانوں کو مادہ پرستی سکھا رہی ہے، انہیں راتوں رات امیر ہونے، امیر ہونے میں باہم مسابقت کرنے، فرج، ٹی وی، اے سی، بینک بیلنس، کار، کوٹھی کو اس نے ضروریات میں شامل کر دیا ہے۔ اس کے لیے حلال وحرام کی تمیز ختم کر دی ہے۔ تو مسلمانوں کو امیر بنانے کی ترغیب اور جذبہ تو مغرب کی یہ الحادی فکر وتہذیب بھی بخوبی دے رہی ہے۔ اس کے لیے علماء کرام کو اور قبلہ مفتی صاحب کو تلقین کرنے کی کیا ضرورت

---

[۱] التغابن ۱۵:۶۴

[۲] سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۴۶۲

[۳] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھۃ الحرص علی الدنیا۔ نیز دیکھیے صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب فی الامل وطولہ

ہے؟ اللہ تعالیٰ تو مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ "فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ" اور مفتی صاحب مسلمانوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ دنیا میں کفار سے آگے بڑھو گویا "فَفِرُّوْا اِلَی الدُّنْیَا"۔

علماء و صلحا کا کام تو یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ جب وہ دین پر، پورے دین پر، عمل کرنے لگیں گے اور اس کا حق ادا کریں گے تو دنیا ان کے قدموں میں ہوگی۔ قطعِ اسباب میں بھی وہ ساری دنیا سے آگے ہوں گے۔ دین سے حقیقی اور شدید وابستگی ان کی صلاحیتوں کو ابھار دے گی اور انہیں دنیا کا امام بنا دے گی۔ مسلمان یہ تجربہ دنیا میں کر چکے اور بارہ سو سال تک، میرٹ پر، دنیا پر حکومت کر چکے جبکہ اسلام اور اس کی تہذیب سارے ادیان اور ساری دنیا پر غالب تھی۔ آج بھی مسلمانوں کی برتری، غلبۂ اسلام اور اظہارِ دین کا یہی طریقہ ہے۔ مسلمان علماء و صلحاء نے پچھلے چودہ سو سال میں کبھی مسلمانوں کو دنیا میں آگے بڑھنے کی تلقین نہیں کی بلکہ دین پر عمل کی ترغیب دی ہے۔ اچھا مسلمان بننے اور تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور اسی کا نتیجہ آخرت کے ساتھ دنیا میں بھی کامیابی ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

* ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿139﴾﴾ [آل عمران ۳:۱۳۹]

* ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿105﴾﴾ [الانبیاء ۲۱:۱۰۵]

* ﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿10﴾ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿11﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿12﴾ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿13﴾﴾ [نوح ۷۱:۱۰ تا ۱۳]

اور ایک طویل حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم بے وزن ہو جاؤ گے جس طرح کہ جھاگ ہوتی ہے اور تمہارے دشمن تم پر اس طرح جھپٹیں گے جیسے بھوکے دستر خوان پر لپکتے ہیں۔ صحابہ کرام نے کہا کہ کیا ہماری تعداد کم ہو جائے گی؟ فرمایا نہیں۔ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری کمزوری کا سبب دنیا کی محبت اور آخرت کی فکر نہ کرنا ہوگا۔ [۱]

خلاصہ یہ کہ دنیا میں کامیابی کا نسخہ دنیا کے پیچھے بھاگنا اور کثرت دنیا کی خواہش، طلب

---

[۱] سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۲۹۷

اور جد وجہد نہیں بلکہ آخرت کی فکر اور دنیا سے بے نیاز ہونا ہے۔

۶۔ پھر ''اللہ کو پارٹنر بنانے'' کے الفاظ یا اصطلاح بھی مسلم علمی روایت میں غیر مانوس اور اجنبی ہے۔ اس کو آپ یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ کوئی تاجر نیت کرے یا منت مانے کہ اگر مجھے اس تجارت میں منافع ہوا تو میں اس کا اتنے فیصد اللہ کی راہ میں (یا فلاں فلاں مد میں) خرچ کروں گا لیکن اللہ کو پارٹنر یا شریک بنانا عجیب اصطلاح ہے کیونکہ علماء کرام جانتے ہیں کہ فقہ میں 'شریک' اور 'شراکت' کے کیا مسائل اور اختیارات ہوتے ہیں۔

غرض راقم آثم کو مفتی صاحب کی مسلمانوں کو یہ تلقین کہ وہ دنیا میں آگے بڑھیں اور اس میں کفار سے مسابقت کریں، دینی لحاظ سے نامانوس اور اسلاف کے رویہ کے مطابق نہیں لگی تو یہ چند گزارشات عرض کر دیں۔ ان کے اخلاقِ عالیہ سے توقع ہے کہ وہ اس کا برا نہیں منائیں گے اور راقم کو اگر بات سمجھ نہیں آئی تو سمجھا دیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

بقیہ: جماعت اسلامی کی قیادت کو فکر مندی کی ضرورت

۵۔ پاکستانی معاشرے میں مادہ پرستی اور کمرشلزم کے بڑھتے ہوئے رجحان بلکہ سیلاب نے پاکستانی قوم بلکہ دینی قوتوں اور ان سے وابستگان کے دینی مزاج اور دینی سرگرمیوں کو بھی روند ڈالا ہے۔ جماعت اور اس کی ذیلی تنظیموں اور اس سے وابستہ افراد نے سیکڑوں نہیں شاید ہزاروں سکول کالج قائم کر رکھے ہیں اور پانچ یونیورسٹیاں بھی جماعتی افراد کی ہیں لیکن یہ سب مغربی فکر و تہذیب کی بالادستی کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں اور یہ ادارے چلانے والوں کے پیشِ نظر پیسے کمانا ہے۔ دعوت واصلاح اور تربیت اور معاشرے کی اصلاح اور مغربی تہذیب کا ردّ کسی کے پیشِ نظر ہے ہی نہیں۔

اس موضوع پر لکھنا شروع کیا تو یہ چند نکات ذہن میں آ گئے۔ ان سے مقصود جماعت پر تنقید نہیں بلکہ قیادت کو توجہ دلانا ہے کہ وہ جماعت کو تجدد سے بچانے کی اور مغربی فکر و تہذیب کی بالادستی کے سیلاب سے بچانے کی فکر کریں کہ تحریک اسلامی کی قیادت کی ذمہ داریوں کا تقاضا یہی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

ڈاکٹر اسعد زمان[1]

فکرو دانش

'عصر حاضر میں احیائے اسلام'

اصل چیلنج علمی و فکری ہے

کچھ عرض کرنے سے قبل مَیں ڈاکٹر محمد امین صاحب اور ان کے رفقاء کو ہدیۂ تحسین وتبریک پیش کرتا ہوں کہ جنہوں نے اہلِ علم کو تفکیر کے لیے اکٹھا کیا۔

مَیں بہت زیادہ مغرب زدہ انسان تھا۔ مجھے مغرب کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں میں پڑھنے کا موقع میسر تھا۔ مجھے دعوت وتبلیغ والے ملے تو ان کے ملنے سے مجھے ایمان کی روشنی ملی، تب مجھے معلوم ہوا کہ تمام چیزوں میں ایمان مقدم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [البقرہ۲:۲۵۷]

یہ آیت مجھے حیرانی میں ڈال دیتی تھی کہ ہمارے نزدیک تو نُورِ علم ہے اور علم تو سارا مغرب کے پاس ہے، ہم مسلمان تو تاریکی میں ہیں تو یہ بات تو قرآن حکیم سے ٹکراتی ہے۔ مَیں نے کئی سالوں تک اس بارے میں اللہ سے رہنمائی مانگی تو مجھ پر عقدہ کھلا کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میدانِ جنگ میں ہم شکست سے دو چار ہوئے مگر اس سے بڑی شکست ہمیں علم کے میدان میں دی گئی۔ ایک ہزار سال تک مسلمانوں کا چار دانگِ عالم میں بول بالا تھا، اس لیے نہیں کہ ہمارے پاس حکومت تھی بلکہ اس لیے کہ ہمارے پاس سب سے زیادہ علم تھا۔ جب بغداد کی لائبریریاں جلائی گئیں تو لاکھوں کتابیں نذرِ آتش کی گئیں۔ یوں ہماری ہارڈ ڈسک ضائع کردی گئی، سارا علم ضائع کر دیا گیا۔

---

[1] یہ ڈاکٹر اسعد زمان صاحب (سابق وائس چانسلر PIDE ومعروف ماہر معاشیات ودانشور) کا وہ خطاب ہے جو انہوں نے ۱۷ دسمبر ۲۰۲۳ء کو اسلام آباد میں مجلس فکر ونظر کے سیمینار میں 'عصرِ حاضر میں احیائے اسلام' کے موضوع پر کیا۔ اس کو رکنِ ادارت حافظ محمد عمران طحاوی صاحب نے مرتب کیا ہے۔

یورپ کس طرح قرونِ مظلمہ سے نکلا یہ ایک الگ بحث ہے۔ اندلس میں عربی کتب کے ترجمے کروائے گئے اور ان کے ذریعے قرونِ مظلمہ کی سیاہی کاٹی گئی۔ علم کی وہ روشنی جو وحی کے ذریعے سے ۱۴ سو سال پہلے اتاری گئی تھی اُسی روشنی نے یورپ کو بھی منور کر دیا۔ اب ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ سارا علم مغرب کے پاس ہے، مسلمانوں کے پاس علم ہے ہی نہیں۔ جو بھی چار سال یونیورسٹی میں پڑھ لیتا ہے وہ یہی سیکھتا ہے کہ قرآن کا علم متروک ہو چکا ہے کیونکہ وہ ان چار سالوں میں صرف اہل مغرب کی کتابیں پڑھتا ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں کام آنے والا علم صرف مغرب کے پاس ہے۔ یہ سارا علم جو پچھلے ۳۰۰ سال میں وضع ہوا ہے اس کا قرآن وحدیث سے کوئی واسطہ نہیں۔ معاشیات میرا مضمون ہے۔ جو بات ٹیکسٹ بکس میں پڑھائی جاتی ہے اس کا ہمارے دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ بڑی پریشانی کی بات ہے۔

اس کو ہم یوں حل کرتے ہیں کہ ہمارا دین ہمیں آخرت میں کامیابی دے گا جب کہ یہ دنیاوی علوم ہمیں دنیا میں کامیابی دیں گے۔ مگر سچ کہوں تو یہ کوئی معقول حل نہیں ہے۔ یہ اللہ کا دیا ہوا علم ہے۔ اس کی تاثیر ملاحظہ کریں کہ دنیا کی پست ترین قوم کو چند سالوں میں دنیا کی سرداری عطا کر دی۔ ہمیں آج بھی اس علم کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ہر مشکل کا حل اللہ نے دیا ہے تو ہم اور مشکلات میں کیوں پڑتے ہیں۔ اس علم سے کیوں استفادہ نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا‌ ؕ ﴾[المائدہ۵:۳]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دین کامل واکمل ہے اور ہر زمانے میں ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں قرآن کا کوئی تذکرہ نہیں، اس لیے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ قرآن کا علم آج کی دنیا کے لیے فرسودہ اور ناقابلِ عمل ہے۔ اس کا دنیا کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس علم کو جس نے ہمیں ایک ہزار سال تک سرداری بخشی تھی وہ آج بے کار ہو گیا ہے۔ اس معمہ کے بارے میں مَیں دعا کرتا رہا آخر کار مجھے یہ بات بتدریج سمجھ میں آئی کہ امت اس وقت ایک ایسے مرحلے سے گزر رہی ہے جو پہلے کبھی نہیں گزری کہ ہم شکست خوردہ ہیں ہزار

سال تک ہم فاتح تھے، غالب تھے۔ابن خلدون نے لکھا کہ جب کوئی قوم مفتوح ہو جاتی ہے تو وہ فاتح قوم کے اطوار اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حال ہمارے ساتھ ہوا کہ ہم مغرب کی نقالی کررہے ہیں ہم مغلوب ہو کر فکری غلام بن گئے ہیں۔ایک حدیث میں پیشین گوئی تھی کہ دین اجنبی بن کر آیا تھا اور اجنبی بن جائے گا۔آج دین کے ایسے ہی حالات ہیں۔ ہمارے پاس اگر دین ہوتا تو آج اس مجلس کی ضرورت نہ ہوتی ہم میدانِ کارزار میں ہوتے۔

علمی میدان میں شکست کھانا مسلمان کو زیب نہیں دیتا اس لیے کہ جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم ہے اسے کسی بھی میدان میں شکست نہیں کھانا ہوتی۔ اللہ کے علم کی فوقیت تمام علوم پر ایسے ہی ہے جیسے اللہ کی فوقیت تمام مخلوق پر۔آج کی دنیا میں یہ علم مؤثر کیوں نہیں رہا اس کی ایک تفصیل ہے جو مَیں مختصراً بتا تا ہوں۔کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم میدان میں اتر کر دکھائیں کہ یہ علم آج بھی مؤثر اور قیمتی ہے۔عرب کے ایک مشہور پہلوان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا کہ میں آپ کی دعوت تب مانوں گا جب آپ مجھے کشتی میں ہرا دیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کشتی کے اکھاڑے میں اترے اور اسے چت کر دیا۔وہ حیران ہوا اور بولا دوبارہ آؤ۔رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے اسے پھر چت کر دیا۔ وہ تیسری بار بولا کہ ایک بار اور کر کے دکھاؤ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے اس کے میدان میں چت کر دیا تو اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

آج ہماری ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ ہم مغربی اکانومسٹ کو اس کے میدان میں پچھاڑیں کیمسٹ کو اس کے میدان میں اور ہر میدان میں انہیں پچھاڑیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔

ہمارے مدارس میں تمام علوم پڑھائے جاتے ہیں اور وہاں سے فارغ ہونے والے قابل اور نافع ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں دین و دنیا متصل تھے۔اخلاقیات کا معاشیات سے کوئی تعلق نہیں یہ مغرب والے تو کہہ سکتے ہیں مگر ہم یہ کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ ثنویت سیکولرزم کی پیداوار ہے۔

اگر ہم اللہ کے دیئے ہوئے علم پر معاشیات و دیگر علوم کی بنیاد رکھیں تو وہ معاشیات رائج الوقت معاشیات سے بہت بہتر ہو گی۔مگر کیا کریں کہ ہم نے مغربی علوم کے سامنے سجدہ کر رکھا

ہے ان میں خامیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ یہ دکھ بھری کہانی ہے کہ لوگوں نے مغرب کی معاشیات کو ہلکا سا اسلامی ٹچ دے کر قابل قبول بنا دیا ہے۔ اس طرح علوم کو اسلامیانا بیکار ہے۔

ہمیں علوم کو دو حصوں میں بانٹنا ہوگا: فزیکل سائنسز اور سوشل سائنسز۔ فزیکل سائنسز کو چھوڑ کر ہم پہلے سوشل سائنسز پر فوکس کرتے ہیں۔

سوشل سائنسز کا موضوع معاشرے کی تشکیل ہے۔ اسی لیے اسے عمرانی علوم کہتے ہیں۔ ۱۰۰ سال تک یورپ میں عربی پڑھائی جاتی رہی ہے، پھر تراجم کے بعد ان کی زبانوں میں علم کا سفر جاری ہوا۔ یہاں تک کہ مسلم فلاسفرز وحکماء کا حوالہ بھی دینا وہاں جُرم بنا دیا گیا۔ ان معاملات میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دو فرقے بن گئے اور ان میں آپس میں خونریز جنگیں ہوئیں۔ ان میں اہل مغرب کا کافی نقصان ہوا جس کے نتیجے میں انہوں نے دنیاوی زندگی سے دین کو نکال دیا۔ انہوں نے سوشل سائنسز کو دین کے انکار پر کھڑا کیا ہے جو غلط ہے۔ ہمارے پاس اپنا دین ہے اور اس کے دیئے گئے معاشرت کے بہترین اصول بھی۔ ہمیں زیرو سے شروع نہیں کرنا پڑے گا۔ ہمارے پاس ایک ہزار سال کا تجربہ ہے اور ہماری لازوال معاشرت ہے۔ ہمیں امام غزالی کی فلاسفی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سگمنڈ فرائڈ کی فلاسفی کو غلط اور بودا ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ان سوشل سائنسز کی ری کنسٹرکشن کی ضرورت ہے۔ اس پر بہت کچھ کام مسلم دنیا میں ہو چکا ہے۔ اسلامی بنیادوں پر اداروں کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ ان کے علوم نظریۂ علم کی بناء پر غلط ہیں جو غلط اثرات ہی مرتب کرتے ہیں۔ اس گمراہی سے ہمیں نکلنے کی ضرورت ہے۔

جس طرح امام غزالیؒ نے تہافتہ الفلاسفہ لکھی ہمیں تہافتہ المعاشیات، تہافتہ السیاسیات، تہافتہ النفسیات وغیرہ لکھنا ہوں گی۔ اسلام کی بنیاد سے جڑتے ہوئے عصری تقاضوں کو اللہ کے علم کے مطابق اجتہاد بھی ناگزیر ہے۔

جمہوریت کی حقیقت از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
چھپ کر آ گئی ہے، مکتبہ البرہان، لاہور، **0300-4107282**

تفہیم دین

حافظ محمد موسیٰ بھٹو[1]

قرآن حکیم کو محض سیاسی انقلاب کا علمبردار سمجھنے کی نفسیات اور اس کے مخدوش اثرات

عالمِ اسلام کو طاقتور اور متوازن اسلامی فکر کی ضرورت ہے

قرآن حکیم، اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کی جامع کتاب ہے، جو زندگی کے سارے پہلوؤں پر محیط ہے، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاقیات، معیشت، سیاست وغیرہ غرضیکہ انسانی زندگی کے سارے معاملات کے بارے میں قرآن حکیم میں رہنمائی موجود ہے۔ قرآن حکیم کی تشریح احادیث اور سنت رسول کی صورت میں موجود ہے۔

قرآن حکیم بنیادی طور پر ہدایت کی کتاب ہے اور آخرت سنوارنے اور زندگی کے معاملات کو اللہ کی مرضی کے مطابق استوار کرنے کی کتاب ہے۔ سیاست کے بارے میں قرآن حکیم میں رہنمائی اس کا ایک حصہ ہے، لیکن عصرِ حاضر میں بعض مفکرین نے قرآن کو سیاسی انقلاب یا سیاسی تبدیلی کی کتاب کی حیثیت دے کر، اِسی مرکزی نکتہ کے تحت قرآن کی تشریح کی ہے، جس سے زندگی کے دوسرے پہلوؤں اور شعبوں کے بارے میں قرآن کی رہنمائی کا عمل متاثر ہوا ہے اور سرگرمیوں کا ہدف سیاست، سیاسی تبدیلی اور انقلابی تبدیلی ہوگئی ہے اور قرآن حکیم عبدیت کے رنگ میں رنگا ہوا جو فرد تیار کرنا چاہتا ہے، اس کی تیاری کا عمل مشکل ہوگیا ہے۔

بعض حلقوں میں قرآن حکیم کو معاشی انقلاب کی کتاب سمجھا جاتا ہے، اس پر کافی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ سب دراصل جدیدیت سے تاثیر پذیری کا نتیجہ ہے۔

قرآن حکیم کا تقویٰ پر سب سے زیادہ زور ہے۔ تقویٰ سے ہی وہ انسان تیار ہوتا ہے جو قرآن حکیم کو مطلوب ہے یہ تقویٰ ہی ہے جو فرد کو اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس، دین کے حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ابھارنے، اللہ سے تعلق مستحکم کرنے، عبادات کو بہتر طور پر بجالانے اور معاملات ومعاشرت کو بہتر طور پر سرانجام دینے اور پاکیزہ انسان کی

[1] مدیر ماہنامہ 'بیداری' (اردو وسندھی) مربی ومصنف کتب کثیرہ

حیثیت سے زندگی گزارنے کی صلاحیت پیدا کرنے پر ابھار سکتی ہے۔

لیکن اسلام کی سیاسی تبدیلی کی تشریح نے تقویٰ اور اس کے نتیجہ میں دینی مزاج پیدا ہونے والی ساری چیزوں کو دبا دیا ہے اور ان کو ثانوی حیثیت دینے کی نفسیات پیدا کی ہے۔

قرآن حکیم کی اس تشریح کا نتیجہ ہے کہ اس فکر سے وابستہ افراد کا گہرا دینی مزاج پیدا نہیں ہو رہا ہے اور شخصیت میں وہ نکھار اور وہ خصوصیات پیدا نہیں ہو رہی ہیں جو افرادِ معاشرہ کو متاثر کر کے ان کے سیاسی تبدیلی کے کام میں ان کا ہمنوا بنانے میں معاون بن سکے۔

سیاسی تبدیلی یا سیاسی انقلاب کی اہمیت سے انکار نہیں ہے کہ اس کے نتیجہ میں حکومت کا رخ بدل جاتا ہے اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی صورت پیدا ہوتی ہے، لیکن اس طرح کی سیاسی تبدیلی جس سے ریاست کا رخ اسلام سے ہم آہنگ ہوتا جائے، اس کے لیے دو چیزیں ناگزیر ہیں: ایک تو یہ کہ صاحب کردار افراد کی ٹیم موجود ہو جن کی زندگی اسلام کا نمونہ ہو، جو اللہ سے محبت کرنے والے ہوں، جن کی ذاتی زندگی میں اسلام کا گہرا رنگ موجود ہو۔ عبادات، معاملات اور معاشرت وغیرہ میں ان کی زندگی بہتر سے بہتر ہو۔ دوم یہ کہ اس طرح کی سیاسی تبدیلی کے لیے افرادِ معاشرہ قابل ذکر حد تک ذہنی اور عملی طور پر تیار ہوں، جب یہ دونوں چیزیں مفقود ہوں تو اسلام سے ہم آہنگ سیاسی تبدیلی یا سیاسی انقلاب کے برپا ہونے کی صورت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

سیاسی تبدیلی یا سیاسی انقلاب دین کی ایک اہم ضرورت ہے لیکن دین کی ایک اہم ضرورت کو جب نصب العینی حیثیت سے پیش کیا جائے اور دین کے دوسرے سارے تقاضوں کو اس نصب العین کے معاون کے طور پر جزوی حیثیت دی جائے تو اس سے بہت سارے نقصانات ہوتے ہیں۔ ان نقصانات کے ذکر سے پہلے قرآن کی اس تشریح کی افادیت کے کچھ پہلوؤں کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس فکر کی افادیت کے بھی کافی پہلو ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

۱۔ دین کو نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کر کے، اسلام کو دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں بہتر نظامِ زندگی کی حیثیت دینے کی کوشش ہوئی ہے، جو وقت کی اہم ضرورت تھی۔

۲۔ جدید فکر سے متاثر افراد کا اسلام پر فکری طور پر اعتماد بحال کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

۳۔ سیاسی محاذ پر جو اسلامی نقطہ نگاہ سے خلا موجود تھا، اس خلا کو کسی حد تک پُر کرنے کی کوشش ہوئی ہے، اگرچہ اس سمت میں زیادہ پیش قدمی نہ ہوسکی ہے۔

۴۔ کارکنوں کو جدوجہد کے لیے ایک میدان ملا ہے اوران میں سیاسی اعتبار سے جوش خروش پیدا ہوا ہے، اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس جوش خروش میں کمی واقع ہوئی ہے۔

۵۔ مادہ پرست عالمی قوتوں کی طرف سے علمی، فکری اور سیاسی نوعیت کے چیلنج کی ایک حد تک مقابلہ کی صورت پیدا ہوئی ہے لیکن کچھ داخلی اور کچھ خارجی اسباب کی وجہ سے اس چیلنج کے بہتر طور پر مقابلہ کی صورت پیدا نہ ہوسکی ہے۔

۶۔ اس فکر کا ایک بڑا یہ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے متاثر افراد جن سیاسی تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں، ان میں کسی حد تک حمیّتِ دین کے اجزاء پیدا ہونے لگتے ہیں۔

۷۔ اس فکر کو شروع میں فطرت سلیمہ کی حامل بعض شخصیتیں حاصل ہوگئی تھی، ان کے اثرات کی وجہ سے اس فکر کے حامل افراد میں ابتدا میں اصلاحی اور تربیتی پہلو بھی موجود تھا، ان کی وجہ سے سیاسی پہلو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے پایا تھا لیکن ان شخصیتوں کی رخصتی کی وجہ سے سیاسی پہلو پوری طرح غالب ہوگیا۔

۸۔ سیاسی تبدیلی یا سیاسی انقلاب کی اس قرآنی فکر سے متاثر ہوکر ان تحریکوں میں شامل ہونے والے کافی لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی ذاتی کوششوں سے اصلاحِ نفس کے سلسلے میں کافی آگے بڑھے، جن کی بہتر اصلاح ہوئی، جو عبادت اور معاملات و معاشرت میں اسلام کے تقاضوں سے ہمہ آہنگ ہوئے، لیکن اس فکر میں بجائے خود تزکیۂ نفس پر زور نہ ہونے کے برابر ہے۔

۹۔ اِس فکر سے وابستہ افراد نے علم و ادب اور صحافت کے محاذ پر سیکولر فکر کا بہتر طور پر مقابلہ کیا ہے۔ ایک دور میں جب علم و ادب اور صحافت پر لادین قوتوں کا غلبہ تھا اور طبقۂ علماء اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر تھے، اس دور میں اس فکر نے اس محاذ پر اہم خدمات سرانجام دیں۔

۱۰۔ اس فکر نے ایک دور میں جدید تعلیمی اداروں میں بھی طلبہ کو لادین فکر کے اثرات سے بچا کر اسلام سے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

۱۱۔ اس فکر میں قرآن سے کسی حد تک رغبت پیدا ہوئی ہے اور درسِ قرآن کے حلقے شروع ہوئے ہیں، لیکن ان درس قرآن کے حلقوں میں اقامت دین کا موضوع غالب رہا ہے۔

یہ تو اس فکر کی افادیت کے کچھ پہلو تھے لیکن اس فکر کے بعض مضر پہلو بھی ہیں جن پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۱۔ اس فکر کی وجہ سے دین کی وہ ترتیب جو سلف صالحین میں موجود رہی ہے، جس پر امت پورے تسلسل کے ساتھ گامزن رہی ہے، وہ بدل جاتی ہے، دین کا ایک فرض نصب العینی حیثیت اختیار کرنے لگتا ہے۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخلصانہ اطاعت کے ذریعہ اللہ سے تعلق کو مستحکم کرنے کا کام ثانوی حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

۳۔ اللہ سے والہانہ محبت، ذکر و فکر اور عبادت سے شغف کی طرف آنے کے لیے آمادگی نہیں ہو پاتی۔

۴۔ نفس کی قوتیں جو سارے فتنہ و فساد کا مرکز ہیں، بالخصوص باطن کی وسیع دنیا، جہاں حرص و ہوس، حسد، جلن، حبِّ دنیا و حب جاہ اور جذبۂ شہرت و خودنمائی جیسے طاقتور بت ایسے ہیں جو افراد کے اعمال کو غارت کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان طاقتور بتوں سے بچاؤ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان کا ادراک بھی سلب ہونے لگتا ہے۔

۵۔ سیرت و کردار کی تعمیر کا کام متاثر ہوتا ہے۔

۶۔ افرادِ معاشرہ کو اپنے کردار کی خوشبو کے ذریعہ قریب کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔

۷۔ ساری سرگرمیوں کا مرکز سیاست اور سیاسی تبدیلی بن جاتی ہے اور دینداری رسمی نوعیت سے آگے بڑھنے نہیں پاتی۔

۸۔ دل کی سختی نرمی کی صورت اختیار کرنے نہیں پاتی۔

۹۔ اس فکر سے ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ سلف کے منہج پر چلنے والے علماء کرام سے

کدورت پیدا ہوجاتی ہے بلکہ ان کے بارے میں اعتراض کا پہلو غالب ہوجاتا ہے کیونکہ وہ ان کی سیاسی جدوجہد کو نصب العینی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔علماء کرام کے ساتھ ساتھ صحیح اہلِ تصوف اور اہل اللہ سے بھی ان کی دوری اور ذہنی بُعد پیدا ہوجاتا ہے حالانکہ علماء کرام اور صحیح اہلِ تصوف ملت کا سرمایہ ہوتے ہیں، ان سے تو استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۰۔ ذہن کے ساتھ ساتھ دل کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے پر زور نہ دینے کی وجہ سے دل میں موجود خلا آخر وقت تک موجود رہتا ہے جو عقل اور عقلیت کے زیادہ استعمال سے کسی صورت میں پُر ہونے نہیں ہو پاتا۔اس کی وجہ سے عمل سے زیادہ منصوبہ بندی پر زور ہوتا ہے اور عمل کے موقع پر آگے بڑھنے کی ہمت وحوصلہ کا فقدان ہوتا ہے۔

اس تجزیہ سے قرآن اور اسلام کی سیاسی تبدیلی کو ہدف قرار دینے والی تشریح کے فوائد واثرات اور اس کے مضر پہلو پوری طرح سامنے آئے۔

ہمارا مقصود تنقید برائے تنقید نہیں ہے، ہمارا مقصود اصلاح ہے اور سلف صالحین کی اسلامی تشریح کے تسلسل کو قائم رکھنے کی ضرورت پر زور دینا ہے اس لیے کہ سلف صالحین کی اسلامی تشریح میں اسلام کے سارے پہلو اور سارے تقاضے صحیح ترتیب کے ساتھ موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم فرد کا ایسا مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں عبدیت کا رنگ غالب ہو۔جب عبدیت کا رنگ غالب ہوگا تو فرد دین کے ہر تقاضے پر آمنا صدقنا کہ کر اسے پورا کرنے کے لیے کوشاں ہوگا۔اگر جہاد کا موقعہ ہوگا تو فرد جذبۂ جہاد سے سرشار ہوکر اس میں شریک ہوگا۔اگر سیاسی تبدیلی کا موقعہ ہوگا تو فرد اس میں اپنے حصہ کا کردار ادا کرے گا۔اگر دینی ودعوتی اداروں سے مالی اور عملی معاونت کی ضرورت ہوگی تو فرد اس میں پیش قدمی کا مظاہرہ کرے گا۔اس لیے قرآن اور اسلام کا جو مطلوب انسان ہے یعنی جذبۂ عبدیت سے سرشار انسان (جو عبادت اور ذکر وفکر اور صحیح ذہن سازی سے پیدا ہوگا) اس طرح کے افراد کی تیاری کی ضرورت ہے، نہ کہ دین کی یک طرفہ ضرورت کے حامل افراد کی۔

یہاں ایک اہم غلط فہمی کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔قرآن سے سیاسی انقلاب یا سیاسی تبدیلی کے کام کو نصب العینی کام سمجھنے کی جو غلط فہمی ہوئی ہے وہ اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اللہ کے

رسول اللہ ﷺ نے اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کی اور عملاً انقلاب قائم کر کے دکھایا۔اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہی نہیں، بلکہ اس کی نصب العینی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کے سیاسی غلبہ کا کام کرے۔اگر افرادامت ایسا نہیں کریں گے تو ان کے دوسرے اعمال مسترد کر دیئے جائیں گے اس لیے کہ نصب العینی کام کا بدل دوسرے کام نہیں ہو سکتے۔

اس فکر کے حاملین کو اللہ کے رسول ﷺ کی اس حیثیت کو سمجھنے میں دشواری پیش آئی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ پوری انسانیت کے رسول ہیں اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے رسول ہیں۔ انسانیت تک دین کے اتمامِ حجت کے لیے ضروری تھا کہ آپ ﷺ کے ذریعہ مثالی انقلاب برپا ہو اور اس کے اثرات پوری انسانیت پر پڑیں۔اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحابہ کرامؓ کی صورت میں ایسے ساتھی عطا فرمائے، جن کی آپ نے تربیت فرمائی، تزکیہ کیا اور انہیں نورِ نبوت کے اجزاء سے فیضیاب فرمایا۔انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کی قربانی دے کر کفر کا مقابلہ کیا اور اس طرح مثالی اسلامی ریاست قائم ہوئی۔

اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھوں مثالی اسلامی انقلاب کا قائم ہونا، یہ آپ کے ساتھ مخصوص تھا۔امت کے افراد اس طرح کے انقلاب برپا کرنے کی نہ تو صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ ہاں افرادِ امت کی یہ ذمہ داری ضرور ہے کہ وہ اسلام پر عمل پیرا ہوں اور معاشرے اور ریاست کو اسلام سے ہم آہنگ بنانے کے لیے ہر ممکن حد تک کوشاں ہوں۔لیکن جب افرادامت کی حالت یہ ہو کہ ان کی ذاتی زندگیوں سے اسلام بڑی حد تک رخصت ہو گیا ہو اور افراد میں پانچ فٹ کی شخصیت پر اسلام کو قائم کرنے کی استعداد نہ ہو تو اس طرح کی صورتحال میں سیاسی تبدیلی کے کام کو دین کے نصب العینی کام کی حیثیت دینے کا مطلب اپنی اصلاح (یعنی تزکیۂ نفس) کی سرحدوں سے آگے بڑھ کر کام ہاتھ میں لینا ہے، جو نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔

ہمارا مقصد دین کے سیاسی غلبہ کے کام کی اہمیت کو کم کرنا ہر گز نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک تو یہ کام دین کا نصب العینی کام نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ یہ کام ذاتی اصلاح یعنی تزکیۂ نفس کی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔اس کام کی اہمیت یہ ہے کہ آزاد مسلمان ملک میں اگر دین کے سیاسی

غلبہ کا کام نہ ہوگا تو ساری ملت گنہگار شمار ہوگی لیکن اس کی ترتیب یہی ہے کہ کام کا آغاز افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ افراد اور معاشرہ کی تو اصلاح نہ ہو، اوپر سے غلبہ دین کا کام ہو جائے۔

اس حقیقت کو سمجھنا از حد ضروری ہے کہ سیاسی انقلاب یا سیاسی تبدیلی کا کام پانچ فٹ کی شخصیت پر اقامتِ دین یعنی دین کو قائم کرنے اور اس پر عمل کرنے سے شروع ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں مادیت پرستی کا سیلاب اتنا تیز تر ہے کہ لگ بھگ ہر فرد ایمانی اعتبار سے حالت خطرہ سے دوچار ہے۔ دین کی سیاسی سطح پر اقامت کا کام جتنا ضروری ہے، اس سے کہیں زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ دین کو اپنی ذات اور اپنی شخصیت پر لاگو اور جاری کیا جائے، اور عالمگیر طاغوت کے برپا کردہ فتنوں سے بچا جائے۔ عالمگیر طاغوت کے فتنوں سے اپنے ایمان کی حفاظت کرنا، یہ سب سے اہم اور بنیادی کام ہے۔ اس کے بغیر سیاسی تبدیلی یا سیاسی انقلاب کی باتیں فضا میں تحلیل ہونے والی باتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ وابستہ افراد کے ایمان کو مستحکم کرنے کا کام ایسا ہے، جو عبادت، ذکر وفکر کے اہتمام، تزکیۂ نفس اور اللہ سے تعلق مستحکم کرنے سے ہی ہو سکتا ہے، اس لیے سیاسی تبدیلی کے کام میں ذکر وفکر کو فیصلہ کن اہمیت دینا ناگزیر ہے۔

سلف میں معاشرے کی سطح پر اقامتِ دین اور غلبۂ دین کے کام کے دو طریقہ کار رہے ہیں۔ ایک یہ کہ افراد معاشرہ کی دینی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بہتر سے بہتر تربیت کی جائے تاکہ مؤثر طبقات (جن میں حکمران بھی شامل ہیں) کے برپا کردہ فتنوں سے نفس کے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔ سلف کی یہ دعوتی حکمت عملی ہر دور میں کامیاب رہی ہے اور دینی اور اخلاقی اعتبار سے کبھی بھی معاشرے کی حالت زیادہ خراب نہیں ہو پائی، اس لیے کہ افراد معاشرہ کی پشت پر اہل اللہ کے مراکز موجود رہے ہیں۔

سلف کی دعوتی حکمت عملی کا دوسرا پہلو یہ رہا ہے کہ حکمرانوں سے قریبی تعلق رکھنے والے افراد پر اثر انداز ہو کر اور ان کی تربیت کے ذریعہ حکمرانوں کے خلافِ شرع اقدامات کی روک تھام کا کردار ادا کیا جائے اور حکومت کے رخ کو بگاڑ پر جانے سے بچایا جائے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ

نے ایسا ہی کیا اور بادشاہِ وقت سے قریبی تعلق رکھنے والے اپنے متعلقین کو اس بات پر اکسایا کہ وہ حکمت کے ساتھ بادشاہِ وقت کو اکبر کے دور کے وقت کے خلافِ شرع اقدامات اور پالیسیوں کی تبدیلی پر آمادہ کریں۔ حضرت مجدد کے معتقدین نے یہ خدمت بہتر طور پر سرانجام دی، جس کی وجہ سے اکبر بادشاہ کی سربراہی میں ہندوستان میں اسلام کو ہندو مذہب میں ضم کرنے کی جو کوششیں منظم طور پر شروع ہوئی تھیں، وہ ناکام ہوگئیں۔

اس دور میں بھی سلف کی اس حکمت عملی سے استفادہ کی سخت ضرورت ہے۔

آخر میں یہ نکتہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اس وقت جب کہ پورا عالم اسلام مغرب کی ذہنی اور سیاسی غلامی سے دوچار ہے اور اپنی پالیسیاں بنانے میں مغرب کی مرضی کا محتاج ہے، اس طرح کی صورتحال میں اسلام کے سیاسی فکر کی زیادہ ضرورت ہے۔

اس دور میں ریاستی ادارے افرادِ معاشرہ پر ہر اعتبار سے اثر انداز ہیں۔ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ان کی ذہنی سازی کرنا، اپنی معاشی پالیسیوں کے ذریعہ لوگوں کی معاشی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے میں کردار ادا کرنا، سیاسی پالیسیوں کے ذریعہ سیاست کو منفی مقاصد کے لیے استعمال کرنا، قوم اور ملت کی باگ کو عالمی طاغوت کے حوالے کرنا، قوم پر سیکولر نوعیت کی پالیسیوں کو مسلط کرنا وغیرہ وغیرہ، اس لیے سیاست پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کی حامل ہوگئی ہے، لہذا سیاسی تبدیلی کا کام اب زیادہ ضروری ہوگیا ہے اور دین کے بہت سارے تقاضے بھی اس سے وابستہ ہیں۔

لیکن اس کے لیے ضرورت ہے کہ فکر میں تزکیۂ نفس اور اللہ سے محبت کے کام کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہو اور اس فکر میں مربیوں اور مزکیوں سے روحانی استفادہ کی بھرپور صورت موجود ہو اور عقل کے ساتھ ساتھ دل کی تبدیلی پر بھی زور ہو، تاکہ اس طرح کے متوازن فکر کے حامل افرادِ معاشرے کی اصلاح میں مؤثر کردار ادا کرسکیں۔ اور اس طرح کے افرادِ معاشرہ کی حمایت سے ملت کو بہتر قیادت مہیا ہوسکے جو ملک کو مغرب کی ذہنی اور سیاسی و معاشی غلامی سے نجات دلا کر اسلام سے ہمہ آہنگ پالیسیاں تشکیل دے سکے اور ملت کو اسلام کی شاہراہ پر گامزن کرسکے۔

تفہیم دین مدیر

جماعت اسلامی کی قیادت کو فکر مندی کی ضرورت

جماعت کے لوگوں کا تجدد کی طرف بڑھتا رجحان قابلِ تشویش ہے

جماعت اسلامی میں مولانا مودودی کی فکر کی بقا و استحکام کے حوالے سے سوشل میڈیا میں ہونے والی بحث میں ڈاکٹر حافظ ساجد انور صاحب نے جو جواب دیا ہے وہ معلوماتی بھی ہے اور یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ جماعت کے بعض حلقے جماعت میں مولانا کی فکر کے مؤثر رہنے کے لیے کئی طرح کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اگرچہ آج کل سیاست کی گہما گہمی ہے اور ہم نہیں سمجھتے کہ جماعت کی قیادت اس جیسے علمی وفکری مسئلے پر غور کے لیے وقت نکال پائے گی تاہم چونکہ بحث چل نکلی ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تحفظات سے جماعت کے قائدین کو مطلع کر سکیں۔

ہماری رائے یہ ہے کہ حافظ ڈاکٹر ساجد انور صاحب کی ذکر کردہ کوششوں کے باوجود جماعت کے اندر خصوصاً پچھلی چند دہائیوں میں نئے بننے والے ارکان و متفقین میں نہ صرف مولانا کی فکر سے وابستگی کمزور پڑتی دکھائی دیتی ہے بلکہ ان کی ایک کثیر تعداد جاوید غامدی صاحب کی متجددانہ فکر کی طرف لپکتی نظر آتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ مولانا مودودی کے بعد جماعت میں کوئی تخلیقی مفکر نہیں رہا۔ مولانا سے کوئی لاکھ اختلاف کرے لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مولانا دین کے متبحر عالم تھے اور درپیش دینی وفکری معاملات میں ایک رائے رکھتے تھے اور نئی راہیں تلاش کر سکتے تھے۔ ان کے بعد بلکہ ۱۹۵۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف اور صف دوم کی قیادت کے دوسرے بہت سے افراد کے نکل جانے سے جماعت میں زیادہ تر وہ کارکن باقی رہ گئے جو مولانا کی فکر کے مقلدِ محض تھے یا ان کی فکر کو دہرانے والے لکھاری تھے۔ نیز مولانا کے بعد جماعتی قیادت میں آنے والے اکثر لوگ وہ تھے جو جمعیت کی قیادت سے آئے تھے اور انہیں پڑھنے لکھنے پر ترکیز کا موقع نہ وہاں ملتا تھا اور نہ جماعت میں آکر ملا کہ تنظیمی وسیاسی معاملات اور دورے ان کے وقت کا بڑا حصہ لے جاتے تھے۔

۲۔ مولانا کی فکر میں اگرچہ تجدد کے اثرات شروع ہی سے موجود تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد سیاسی تقاضوں کی وجہ سے اور روایتی علماء کی طرف سے جماعت کی شدید مخالفت کی بناء پر وہ لہر مدھم پڑ گئی تھی۔

۳۔ مولانا گوہر رحمٰن، مولانا محمد چراغ، مولانا سیاح الدین کاکاخیل اور مولانا معین الدین خٹک وغیرہ کے بعد جماعت میں بڑے علماء نہ رہے اور مولانا عبدالمالک صاحب (اللہ تعالیٰ انہیں تادیر صحت سے نوازے) کی پیری اور ضعف کے بعد جماعت کے حلقوں میں (خصوصاً لاہور اور مرکز میں) کوئی بڑا عالم دین نظر نہیں آتا۔ جماعت میں اس کے لیے فکر مندی بھی بظاہر نظر نہیں آتی۔ جماعت نے کئی لوگوں کے توجہ دلانے کے باوجود کوئی بڑی دینی جامعہ بھی قائم نہیں کی جس سے علماء کی کھیپ نکلتی رہتی۔ مولانا عبدالمالک صاحب کا قائم کردہ مدرسہ جامعہ مرکز العلوم الاسلامیہ منصورہ سے باہر ہے اور وسائل سے محروم ہے۔ مولانا مودودی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تھا لیکن وہ کوئی بڑی دینی علمی روایت قائم نہیں کر سکا۔ اس سلسلے میں بھی جماعت میں فکر مندی نظر نہیں آتی۔

۴۔ یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی وجہ سے پاکستان میں (بلکہ ساری دنیا میں) مطالعۂ کتب کا رجحان کمزور پڑ گیا ہے اور اس کے مقابلے میں سننے اور دیکھنے کے رجحانات کو تقویت ملی ہے۔ غالباً اس وجہ سے جماعت میں پچھلی چند دہائیوں میں نئے بننے والے متفقین وارکان میں لازمی مطالعۂ کتب کا رجحان کمزور ہوا ہے اور اب شاید ہی ایسے افراد نظر آتے ہیں جنہوں نے مولانا مودودی کی ساری کتابیں پڑھی ہوں اور مولانا کی فکر کو انہوں نے اچھی طرح سمجھا اور ہضم کیا ہو۔ پچھلے دنوں ہم نے عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کے لیے کی گئی کوششوں کے تجزیے کے لیے ایک سیمینار کا انعقاد کیا تو بعض مقررین نے تبصرہ کیا کہ اس طرح کے موضوعات اب ہماری دینی علمی روایت کا حصہ ہی نہیں رہے خصوصاً جماعت اسلامی میں، حالانکہ اس کی ضرورت کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ لوگ اس پر غور نہیں کرتے ورنہ وہ سمجھتے کہ میڈیا کا غلبہ اور نظریاتی بحثوں سے کنارہ کشی پس جدیدیت کے برے اثرات میں سے ایک ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۸)

تفہیم دین مدیر

متجددین کی نشانیاں اور اقسام

مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے عالمی غلبے اور اس کے علمبردار ممالک کی کوششوں کی وجہ سے پاکستان میں متجددین کی تعداد اور سرگرمیاں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ یہ لوگ چونکہ عام مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور خود کو عام مسلمان کی طرح کا مسلمان باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے اکثر عام روایتی مسلمانوں کو پتا نہیں چلتا کہ کون متجدد ہے۔ اس لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ ان کی تعریف، نشانیوں اور اقسام کا ذکر کر دیا جائے تاکہ عام لوگوں کو انہیں پہچاننے میں آسانی رہے۔

تعریف

متجددین وہ علماء، اسلامی سکالرز اور ان کے پیروکار ہیں جو مغربی فکر وتہذیب کو برحق سمجھتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ہو۔ اگرچہ اس تشریح سے اسلام کے مقاصدِ شرعیہ کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔

اقسام: ان کی دو بڑی اقسام ہیں:

ترمیم پسند/تلفیق پسند (Revisionists)

یہ وہ علماء ہیں جو روایت اور روایتی اسلام کو کلیتاً ترک نہیں کرتے بلکہ اس سے جڑے رہتے ہیں یا اس کا تاثر دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مغربی جدیدیت (Western Modernism) کو بھی کسی نہ کسی حد تک قبول کرتے ہیں یا وہ اسلام اور مغربی فکر کی تلفیق اور باہم امتزاج کو قبول کرتے ہیں۔

متجددین (Modernists)

یہ وہ علماء و اسلامی سکالرز ہیں جو روایت، روایتی اسلام، جمہور علماء کی آراء و افکار کو قبول کرنا ضروری نہیں سمجھتے اور اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح کرنے پر اصرار کرتے ہیں جو مغربی فکر وتہذیب کے اصول واقدار کے مطابق ہو کیونکہ یہ مغرب سے مرعوب ومتاثر ہوتے ہیں۔

متجد دین کی نشانیاں

۱۔ اگر ان کے سامنے مغربی فکر و تہذیب کو غلط اور برا کہا جائے، اس کے ردّ کی بات کی جائے تو انہیں برا لگتا ہے اور وہ حیلے بہانے اس کی مدافعت پر اتر آتے ہیں۔ جیسے کہیں گے کہ اہلِ مغرب نے اسلامی اصول اپنا لیے ہیں اور مسلمانوں نے چھوڑ دیے ہیں۔ مسلمان معاشرے کی کمزوریاں اور خامیاں گننے لگیں گے یا کہیں گے کہ اہل مغرب تو اہل کتاب ہیں اور ہمارے بہتر سلوک کے مستحق ہیں وغیرہ۔

۲۔ وہ ڈھال کے طور پر قرآن کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں جس سے حدیث وسنت کا انکار یا کم از کم اس کا استخفاف و تحقیر ہو یا وہ خلافِ قرآن اور خلافِ عقل لگیں۔

۳۔ وہ جمہور علماء اور جمہور امت کی روایت، اجماع وکثرت رائے کو یہ کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں کہ یہ تو اجتہادی آراء ہیں اور ان سے اختلاف جائز ہے۔ بلاشبہ اسلاف کی اجتہادی آراء سے اختلاف جائز ہے خصوصاً محدثات میں، لیکن ہر معاملے میں ان سے اختلاف کرنا خصوصاً دین اور اس کے نصب العین، اہداف وطریق کار سے اختلاف کرتے ہوئے دین کی نئی تشریح وتعبیر لادین مغربی فکر و تہذیب کی روشنی میں کرنا غلط ہے۔ یہ شرعاً بھی نا قابل قبول ہے اور عقلاً بھی۔

۴۔ وہ مستشرقین کی تعریف کرتے ہیں اور بالواسطہ ان کی آراء کو قبول کرتے ہیں۔

۵۔ وہ روایتی علماء کا استخفاف اور ان کی تحقیر کرتے ہیں۔ انہیں ملا، مولوی، مسیٹر کہتے ہیں۔

۶۔ وہ مغرب زدہ حکمرانوں کو پسند کرتے ہیں۔، ان کی خلافِ اسلام پالیسیوں کی حمایت کرتے ہیں یا کم از کم ان کا دفاع ضرور کرتے ہیں۔

۷۔ وہ دین کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے مغرب سے مرعوب اور اس کی پیروی کرنے والے اعلیٰ سماجی طبقات کی خواہشات وعادات اسلام کے مطابق ثابت ہو جائیں۔

۸۔ وہ اپنی وضع قطع اور لباس میں اہل مغرب کی پیروی میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے، داڑھی نہیں رکھتے یا عموماً برائے نام چھوٹی داڑھی رکھتے ہیں۔

اسلام اور پاکستان پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

پاکستان میں احیائے اسلام کی عملی جدوجہد

*تبلیغی جماعت اور دینی مدارس کا جزوی اصلاحی منہج * جماعت اسلامی کا اسلامی جمہوریت کا ماڈل
* ڈاکٹر اسرار احمد کا اسلامی انقلاب کا منہج۔ان مناہج کے غیر مؤثر اور ناکام ہونے کے بعد ہمارا مجوزہ
*''سافٹ انقلاب بذریعہ کلی اصلاح'' کا ماڈل

*** اسلامی تحریکوں، اداروں خصوصاً ڈاکٹر ابصار احمد صاحب اور ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی توجہ کے لیے**

یہ سطور لکھنے کا خیال ہمیں اپنے فاضل دوست اور مہربان ڈاکٹر ابصار احمد صاحب (سابق صدر شعبۂ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی و برادرِ خورد ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی ایک تحریر پڑھنے پر آیا۔ انہوں نے اپنے سہ ماہی علمی رسالے 'حکمتِ قرآن' (شمارہ اکتوبر، دسمبر ۲۰۲۳ء) کے اداریے بعنوان ''اسلام اور کفر: اسلام کا غلبہ'' میں ہماری اور ہمارے کام کی تحسین [۱] کے بعد ہمارے یہ الفاظ (البرہان شمارہ اگست ۲۰۲۳ء سے) نقل کیے ہیں:

''یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان صحیح رُخ میں میں جدوجہد ہی کے مکلف ہیں اور اس کے نتائج اللہ تعالیٰ کے بس میں ہیں، ہم انسانوں کے بس میں نہیں۔پس جس نے اپنی دینی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی وہ کامیاب و بامراد ہے خواہ اس جدوجہد کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔تاہم جس چیز کے ہم مکلف ہیں وہ تدبیر اور حکمت عملی ہے جو منصوص نہیں ہوتی بلکہ ہم مسلمانوں کی اپنی بنائی ہوئی ہوتی ہے،اور ایک حکمت عملی کو مناسب یا مؤثر نہ پا کر اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور دوسری حکمت عملی اختیار کی جا سکتی ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے ہماری اس تحریر پر یہ تبصرہ کیا ہے:

''راقم نے ان سطور میں جو الفاظ نمایاں کیے ہیں، ان کے بارے میں راقم بالکل لاعلم ہے کہ ڈاکٹر امین صاحب کے ذہن میں کیا آپشنز ہو سکتے ہیں۔انہوں نے صرف کلاسیکل منہج ہی کو بار بار دوہرایا ہے کہ پہلے تعلیم و تزکیہ سے فرد کو بدلا جائے، پھر یہی بدلا ہوا فرد معاشرے اور ریاست کو بھی اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیل کر دے گا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ نظری منہج

[۱] اس محبت فی سبیل اللہ کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی توقعات کا مصداق بنائے (آمین)

ہے جس پر عمل کرتے ہوئے اسلامی تحریکات ایک طویل عرصے سے لوگوں کی ذہن سازی اور کردار سازی کر رہی ہیں لیکن احتجاج جلوسوں اور جلسوں سے آگے بات نہیں بڑھی۔ مسئلے کی واقعاتی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ آبادی کا بڑا حصہ چار چھ دہائیوں سے نہیں بلکہ ایک دو صدیوں سے منفی تعلیمی اور تہذیبی عمل کے نتیجے میں اسلام کی ''مطلوبہ سطح'' اور داخلی و وجودی تبدیلی پیدا نہیں کرسکا، اور نہ ہی کسی ایسی بڑی تبدیلی کا ان کی زندگی میں کوئی فی الفور امکان ہے۔ وہ اسلام سے اپنا عمومی اعتقادی تعلق قائم رکھنے کے لیے کسی ہفتہ وار درس قرآن کے ساتھ نماز روزے کا اہتمام ہی کرلیں تو بڑی بات ہے۔ ان سے غلبہ اسلام کے لیے کسی تحریک، مہم یا اجتماعی کوشش میں مستقل بنیاد پر ایک فعال کارکن بننے کی امید رکھنا بہت دور کی بات ہے۔''

* ڈاکٹر صاحب نے میرے نقطۂ نظر کو' کلاسیکل اپروچ'' قرار دے کر یہ کہا ہے کہ اس پر تو جدید دینی تحریکوں نے عمل کیا ہے لیکن عوام کئی صدیوں کے انحطاط اور منفی تعلیمی و تہذیبی عوامل کی وجہ سے اس قابل ہی نہیں کہ وہ ان کی پکار پر لبیک کہہ کر 'اسلامی انقلاب' برپا کردیں۔

اسی طرح کا ایک نقطۂ نظر ہمارے مہربان ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا ہے جو کہتے ہیں کہ میری اپروچ آئیڈیالسٹک ہے اور صرف فرد کی اصلاح سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ مغرب کا غلبہ اتنا ہمہ گیر اور جابرانہ ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے اور سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے اسلامی نظام 'نافذ' کرنے کے لیے ریاستی قوت ناگزیر ہے جس کے لیے پرامن سیاسی جمہوری انتخابی جدوجہد ضروری ہے تاکہ اقتدار اسلامی انقلابیوں کے ہاتھ آجائے۔ [البرہان ستمبر ۲۰۲۳ء انگریزی مضمون]

ڈاکٹر ابصار صاحب کا نقطۂ نظر ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم اور تنظیم اسلامی کے تناظر میں ہے جبکہ ڈاکٹر انصاری صاحب کا مؤقف مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے تناظر میں ہے۔ ان دونوں آراء کا فکری مرجع مولانا مودودی کا تصور ''اقامتِ دین'' ہے جو ہمارے نزدیک دین کی عصری تطبیق کا ایک غیر متوازن اور یک رخا مظہر ہے۔

اسی طرح ہم تبلیغی جماعت کے اصلاحی اور دینی مدارس کے تعلیمی منہج کو دین کی صحیح، متوازن اور جامع (ہولسٹک) اپروچ کے مقابلے میں عصری تطبیق کے حوالے سے جزوی اور

غیر مؤثر سمجھتے ہیں۔

یاد رہے کہ ہم (تجدد کے مقابلے میں) دین کی روایتی تعبیر کے قائل ہیں اور ان معنوں میں ہمیں قرآن وسنت اور ماضی میں جمہور علماء اور جمہور امت کی طے کردہ دین کی تشریح سے کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہمیں اصولی طور پر پاکستان میں معمول بہ احناف کے فقہی وکلامی مسلک سے کوئی اختلاف ہے بلکہ ہم اس کے موید ہیں تو پھر ہمارا مؤقف کیا ہے؟ اسی کی وضاحت ہم یہاں کرنا چاہتے ہیں۔

* ہماری ایک کمزوری یہ ہے کہ ہم بڑے بڑے حقائق کو سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ اکثر لوگ اس اسلوب کو دقیق، ثقیل اور عسیر الفہم نہ ہونے کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ یہ ’غیر علمی‘ ہے، یہ ’غیر فلسفیانہ‘ ہے اور اس میں ’علمی گہرائی‘ نہیں ہے، اس میں کوئی ’نئی تھیوری‘ نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ؎ نہ سہی میرے اشعار میں معنی نہ سہی۔ ہمارے نزدیک لکھنے کا مقصد اپنے علم کا اظہار کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد ابلاغ ہوتا ہے تاکہ ہماری بات اور اس کا وہ مفہوم جو ہم لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ ان تک پہنچ جائے اور ان کی سمجھ میں آ جائے۔

* ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ہر عصر کے مسلمانوں کو کچھ تحدّیات (چیلنجز) کا سامنا ہوتا ہے اور اس عصر کے علماء اور مفکرین اس چیلنج کے لحاظ سے دین کی تشریح اور عصری مسائل پر اس کی تطبیق کرتے ہیں جیسے دوسری صدی ہجری میں یونانی فکر کی وجہ سے اعتزال کا فتنہ اٹھا تو امام احمد بن حنبلؒ اس پر ڈٹ گئے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، اس کی مخلوق نہیں اور اس پر کوڑے کھائے اور جیل کاٹی۔ آج ہمیں لگتا ہی نہیں کہ یہ کوئی مسئلہ ہے۔ پھر منگولوں کا چیلنج سامنے آیا۔

آج عصرِ حاضر کا چیلنج کیا ہے؟ یعنی اسلام اور مسلمانوں کو کن بڑے چیلنجز کا سامنا ہے؟ ہمارے نزدیک دو بڑے چیلنج ہیں جو امت مسلمہ اور اس کے علماء و مفکرین کو درپیش ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ سقوطِ خلافت ۱۹۲۴ء کے بعد سے درپیش ہیں: ایک یہ کہ امت کو زوال سے کیسے نکالا جائے؟ اور دوسرے مغرب کی الحادی فکر و تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک کی اسلام اور مسلم دشمنی کے علی الرغم اظہارِ دین کی راہ کیسے ہموار کی جائے؟[۱]

---

[۱] دوسرے بہت سے چیلنجز کا انکار یہاں مقصود نہیں بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ دونوں بڑے چیلنج ہیں یا ام الامراض ہیں۔

* ان دو بڑے چیلنجز کے جواب میں مسلم برصغیر میں دو طرح کی بڑی تحریکیں ابھریں۔ روایتی علماء کی طرف سے دیوبند کی تعلیمی تحریک اور تبلیغی جماعت کے نام سے اصلاحی تحریک اور جدید دینی تحریکوں میں سے مولانا ابوالاعلی مودودی کی سیاسی تحریک بعنوان 'جماعت اسلامی'۔ اور اسی کے ذیل میں ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی۔ تزکیہ وتصوف کے حلقوں اور جہادی تنظیموں کو ہم ان دو تحریکوں کے ضمن میں بھی سمجھ سکتے ہیں (اگرچہ بعض جگہ ہم نے اپنی تحریروں میں ان کا الگ سے ذکر کیا ہے) کیونکہ تحریکِ دیوبند تصوف کی قائل ہے اور جہادی تحریکیں 'اقامتِ دین' کی پرامن سیاسی تحریک کی ناکامی کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں اور ان کا فکری مرجع 'اقامت دین' کا فلسفہ ہی ہے۔

ہم سطور ذیل میں مختصر تجزیہ کر کے بتائیں گے کہ یہ تحریکیں متذکرہ بالا دو چیلنجز کے مقابلے میں کیوں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکیں اور یہ کہ اب تیسرے نئے متبادل منہج کی تلاش کیوں ناگزیر ہے؟

روایتی علماء کی تعلیمی تحریک

یہ بات ایک تسلیم شدہ اور معروف حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم موحد (Integrated) تھا، اس میں دین ودنیا کی ثنویت (Dichotomy) نہ تھی۔ یہاں تک کہ ملّا نظام الدین سہالویؒ کا 'درس نظامی' بھی موحّد تھا اور علماء دین کے علاوہ معاشرے اور ریاست کو چلانے کے لیے افرادِ کار مہیا کرتا تھا۔ لیکن جب انگریزوں نے مسلم نظامِ تعلیم ختم کر دیا تو علماء نے دیوبند میں جو نظام تعلیم شروع کیا اس میں عصری علوم شامل نہ تھے ان کے پاس عذر یہ تھا کہ ہمیں انگریزی حکومت کے لیے کارکن پیدا نہیں کرنے اور مادی وسائل بھی محدود تھے۔ اس کے باوجود مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے بقول مدرسہ دیوبند کے فکری بانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے کہنے پر نصابِ دیوبند میں عصری تعلیم کے لیے دو سال رکھے گئے اور ایسا چھ سال تک ہوتا رہا لیکن کوئی تعلیمی پروگرام سیٹ نہ ہوسکا اور پھر یہ وقفہ ختم کر دیا گیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے زمانے میں دیوبند اور علی گڑھ میں طلبہ کے تبادلے کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے دیوبند کے طلبہ دنیاوی علوم سیکھنے علی گڑھ اور علی گڑھ کے طلبہ دینی علوم سیکھنے دیوبند جاتے لیکن اس پر بھی بوجوہ عمل نہ ہوسکا۔

یہ ثنویت تقسیمِ ملک کے بعد بھی جاری رہی۔ نہ حکومت نے نظامِ تعلیم بدلا نہ علماء کرام نے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب کے بقول ان کے والد مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے ۱۹۵۱ء میں اعلان کیا کہ ہمیں نہ دیوبند کے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے، نہ علی گڑھ کے نظام کی بلکہ ہمیں ماضی کے، اسلاف کے، موحد نظام تعلیم کی ضرورت ہے، جس میں دین و دنیا کی ثنویت نہ ہو۔ لیکن ایسا نظامِ تعلیم آج تک قائم نہیں کیا جا سکا اور دینی مدارس آج بھی مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے افراد تیار نہیں کر رہے بلکہ صرف مساجد و مدارس اور غم و خوشی کی معاشرتی رسموں (نکاح، طلاق اور جنازہ وغیرہ) کے لیے افراد تیار کرتے ہیں۔ غرض یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دینی مدارس عصری تعلیم نہیں دے رہے بلکہ وہ تو اسلامی معیشت، اسلامی سیاست، اسلامی نظامِ عدالت.... جیسے اسلامی مضامین بھی نہیں پڑھا رہے اور ملک کے کروڑوں بچے جو جدید عصری علوم مغرب زدہ نظامِ تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں جس میں اسلامی تعلیم و تربیت عنقا ہے اور یہی طلبہ بڑے ہو کر معاشرے اور ریاست کو غیر اسلامی انداز میں چلاتے ہیں، لیکن روایتی علماء کرام اور دینی مدارس کو اس نظامِ تعلیم کی اصلاح کا بھی کوئی خیال نہیں۔

اسی طرح دینی مدارس کے نظام تعلیم میں مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کا تفہیمی و تنقیدی مطالعہ بھی شاملِ نصاب نہیں حالانکہ ماضی میں یہی علماء انگریزی استعمار کی مسلح مزاحمت اور سیاسی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے علماء و طلباء جانتے ہی نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب میں کیا خرابیاں ہیں، اس میں مسلمانوں کے لیے کیا علمی، فکری اور عملی چیلنج ہیں اور مسلم اہل علم کو ان سے کیسے عہدہ برآ ہونا ہے۔

اچھا! کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم صرف مدرسہ دیوبند (یعنی حنفی دیوبندی مدارس) کا ذکر کر رہے ہیں بلکہ ہم بحیثیت مجموعی دینی مدارس کے سارے نظام تعلیم کا ذکر کر رہے ہیں خواہ وہ حنفی بریلویوں کے ہوں، اہلِ حدیث حضرات، اہلِ تشیع اور جماعتِ اسلامی کے دینی مدارس ہوں، کیونکہ سب کا یہی حال ہے کیونکہ وہ سب 'دیوبند' کے رول ماڈل کے مطابق کام کر رہے ہیں۔

روایتی علماء کی اصلاحی تحریک

دیوبند کی روایت کے مولانا محمد الیاسؒ نے جب دیکھا کہ دینی مدارس کا دائرہ کار اور دائرہ اثر

محدود ہے اور صرف چند علماء تیار کرنے تک محدود ہے تو انہوں نے عامۃ المسلمین کی اصلاح کے لیے ایک عوامی تحریک شروع کی جو ’تبلیغی جماعت‘ کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ یہ انگریزی استعمار کے دور کی بات ہے لہٰذا انہوں نے اسے ’غیر سیاسی‘ رکھا اور دین کی بنیادی باتوں کلمہ کی تصحیح، نماز روزے، داڑھی تک محدود رکھا۔ دین کا جامع تصور جو پوری زندگی یعنی فرد، معاشرے اور ریاست کی اسلامیت کو محیط ہے غالباً ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ حالانکہ اسی زمانے میں روایتی علماء انگریز کی سیاسی مزاحمت کر رہے تھے، علماء احرار (اور خاکسار) انگریز کو للکار رہے تھے، مولانا مودودی دین کے مکمل نظام حیات ہونے کی بات کر رہے تھے، اقبال عظمتِ رفتہ کی بحالی کے نغمے گا رہا تھا لیکن اس سب کے باوجود مولانا محمد الیاسؒ نے تبلیغی جماعت کو صرف ابتدائی اور بنیادی دینی امور تک محدود رکھا اور اسے اسلام کے کمال وشمول اور سارے شعبہ ہائے زندگی میں کام کا مظہر نہیں بنایا۔ چنانچہ آج بھی تبلیغی جماعت اسی ڈگر پر کام کر رہی ہے۔ پاکستانی معاشرے اور ریاست کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اسے صرف اپنے محدود دینی پروگرام اور چھ نکات سے غرض ہے۔ قرآن کی تعلیم وتدریس بھی اس کی ترجیح نہیں۔ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کا مطالعہ یا اس کی تفہیم وتنقید اور اس کا ردّ بھی کبھی اس کے پیش نظر نہیں رہا۔ وہ دین کے اپنے ایک محدود تصور پر استقلال سے جمی ہوئی ہے۔ اور یہ کوئی تبلیغی جماعت تک محدود نہیں، روایتی حنفی بریلوی علماء کی ’دعوتِ اسلامی‘ بھی اسی منہج کی حامل ہے۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ پاکستان میں روایتی دینی قوتوں کے غیر مؤثر اور ناکام ہونے کی ایک وجہ ان کی مسلک پرستی اور فرقہ واریت بھی ہے۔ اس چیز نے علماء کو متحد نہیں ہونے دیا اور مساجد ومدارس کے نظام کو مسلمانوں کے لیے مفید اور مثبت کردار انجام دینے نہیں دیا۔

قارئین کرام! روایتی علماء کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں کے مطالعے کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ غیر روایتی علماء اور جدید اسلامی سکالرز کی جدید دینی تحریکوں کا طرزِ عمل ان دو معاملات یعنی مسلمانوں کو زوال سے نکالنے، انہیں دوبارہ بام عروج تک پہنچانے اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے چیلنج سے نمٹنے کے لیے کیا رہا ہے؟ برصغیر میں جدید دینی تحریک کے

علمبردار مولانا مودودی اور ان کی جماعتِ اسلامی ہے لہٰذا ہم اسی کے حوالے سے گفتگو کو آگے بڑھائیں گے۔

برصغیر کی جدید دینی تحریک

مولانا مودودی نے یورپ (برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی) اور روس کی عظیم سلطنتوں کے تناظر میں اور مسلمانوں کی سلطنت عثمانیہ کے زوال سے یہ سمجھا کہ اسلام کی عظمت کے لیے ایک عظیم اسلامی ریاست ضروری ہے۔ یہ بات بظاہر کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی (گو مغربی عروج کا ردّ عمل تھی) لیکن مولانا نے اپنے تبحرِ علمی کے باوجود تین ایسے فیصلے کیے جنہوں نے ان کی تحریک کو امت کے لیے اتنا نافع نہیں رہنے دیا جتنا وہ چاہتے تھے۔

ان میں سے ایک فیصلہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے مؤقف کو دینی استناد مہیا کرنے کے لیے قرآن حکیم کی نصوص کی ایسی تشریح کی جو جمہور امت سے مختلف تھی[1]۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عصرِ حاضر کے روایتی دینی علماء اور ان کی جماعتوں نے مولانا اور ان کی فکر (اقامتِ دین کا مخصوص تصور) اور ان کی جماعت کی مخالفت کی اور اسے ردّ کر دیا جس کی وجہ سے جماعتِ اسلامی مسلمان عوام کی حمایت اور ان کے ووٹوں سے محروم ہو گئی اور بطور سیاسی جماعت ناکامی اس کا مقدر ٹھہری۔

مولانا کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب، جسے مولانا خود ماضی میں 'جاہلیتِ خالصہ' کہتے تھے، انہوں نے اس جاہلیتِ خالصہ کی پیداوار مغرب کی کافرانہ جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا اور اسے ایک مجبوری سمجھنے کی بجائے اسے اقامتِ دین، نفاذِ شریعت اور اظہارِ دین کا صحیح طریقہ قرار دیا۔ یہ اجتہادی فیصلہ چونکہ علمی وفکری لحاظ سے صحیح نہیں تھا اس لیے اس کے نتیجے میں فرد، معاشرے اور ریاست میں اسلام تو نہیں آیا البتہ مغربی تہذیب اور اس کے اصول واقدار خصوصاً سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریل ازم پاکستانی فرد، معاشرے اور ریاست پر غالب آ گئے ہیں۔

مولانا کی تیسری فکری فروگزاشت یہ تھی کہ انہوں نے صرف سیاسی جدوجہد سے

---

[1] قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، تجدید واحیائے دین، خلافت وملوکیت وغیرہ۔

پاکستان میں اظہارِ دین کے لیے کام کی منصوبہ بندی کی حالانکہ مسلمانوں کے عروج کا سبب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابیوں کی پشت پر وہ الٰہی فارمولا کام کر رہا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہدایت الٰہی کی روشنی میں تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے انسان سازی کی یعنی افراد کی تعمیرِ سیرت وکردار کا کام کیا۔ یہی افراد چینج ایجنٹ بنے، انہوں نے اسلامی معاشرہ قائم کیا اور یہ اسلامی معاشرہ بتدریج اسلامی ریاست میں بدل گیا کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست وحکومت [۱] کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں۔ جس طرح مسلمانوں کے عروج کا بنیادی سبب فرد کی تعمیر سیرت وکردار تھا، اسی طرح ان کے زوال کا سبب ایسے افراد کا تیار نہ ہونا تھا جس کا سبب نظام تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کی خرابیاں تھیں لیکن مولانا نے اس بنیادی پہلو پر ترکیز کرنے کی بجائے صرف سیاسی جدوجہد پر ترکیز کی [۲] انسان سازی کا کام نہ کرنے کی وجہ سے (اور بعض دیگر اسباب کی بناء پر) مولانا کی جماعت سیاسی جدوجہد میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔

جماعت کی ان خامیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولانا اور جماعت کی کوئی دینی خدمات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے جدید اسلوب اور طریقِ استدلال اختیار کر کے مغرب زدہ ذہنوں کو اسلام کے قریب لانے میں شاندار کردار ادا کیا۔ جماعت نے پاکستانی آئین وقوانین کو اسلام کے مطابق بنوانے میں کامیابی حاصل کی، پاکستان میں آمریت کا راستہ روکا اور خدمتِ خلق کا کام وسیع پیمانے پر کیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد اگرچہ مولانا مودودی کے تصورِ اقامتِ دین اور اظہارِ دین بذریعہ سیاسی

---

[۱] ذہن میں رہے کہ ''ریاست'' ایک معاصر مغربی اصطلاح ہے جو اصولاً غیر اسلامی ہے۔ مسلم علمی روایت میں یہ اصطلاح کبھی استعمال نہیں ہوئی اور ان معنوں میں صرف حکومت کا لفظ مستعمل ملتا ہے۔

[۲] اگرچہ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں ماچھی گوٹھ میں دعوت واصلاح کے علمبردار علماء وسکالرز کو جماعت سے نکالنے کے بعد آئندہ کا جو لائحہ عمل دیا اس میں (ردِّ عمل کے طور پر) تطہیر فکر کا نکتہ بھی رکھا لیکن بعد کی سیاسی جدوجہد میں یہ صرف کاغذی حد تک موجود رہا۔ عملاً جماعت اسلامی محض ایک سیاسی جماعت بن کر رہ گئی اور تعمیرِ سیرت وکردار اور انسان سازی کا کام (بذریعہ تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس) جماعت کی ترجیحات میں کبھی سرِ فہرست نہ آ سکا۔

جدوجہد کے قائل تھے تاہم انہوں نے مولانا مودودی کی انتخابی جدوجہد کی مخالفت کی اور اپنی الگ جماعت 'تنظیمِ اسلامی' کے نام سے بنالی لیکن تبدیلی بذریعہ تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کو نہ اپنانے اور مولانا مودودی کے مخصوص تصورِ اقامتِ دین اور انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد کو اپنانے کی وجہ سے وہ بھی 'سٹیٹس کو' کو تبدیل نہ کر سکے۔

قارئین کرام! روایتی علماء کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک اور جدید دینی سیاسی تحریک کی خامیوں اور کمزوریوں کا ذکر ہم نے کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذکورہ دو چیلنجز کے حوالے سے مفید، مثبت اور تعمیری کام اتنا نہیں ہوسکا جتنا کہ اس کی ضرورت تھی جبکہ طاقتور مغرب کی اقتداء میں خلافِ اسلام اور مفسد اخلاقی سرگرمیاں زیادہ طاقتور تھیں۔ ایک اور مشکل یہ درپیش ہے کہ دینی مدارس، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی (بشمول تصوف کے حلقے اور جہادی تنظیمیں) اپنی اپنی حکمت عملی میں کسی نظر ثانی یا تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انہیں دعوتِ اصلاح دینے کے ساتھ ساتھ نئی فکری بنیادوں پر تعمیر واصلاح کا کام کیا جائے۔ اس کے لیے ہماری تجاویز کیا ہیں، وہ اب ہم قارئین کے سامنے رکھیں گے۔

ہمارا مجوزہ متبادل ماڈل

مذکورہ بالا مناہج اور ماڈلز کی خامیوں کا ادراک کرتے ہوئے ہم دینی جدوجہد کا ایک نیا ماڈل تجویز کرتے ہیں جس میں یہ خامیاں نہ ہوں اور وہ ماڈل یہ ہے کہ فرد کی اسلامی تناظر میں ایسی جامع ومتوازن تعمیر واصلاح کی جائے کہ وہ نہ صرف اپنی اصلاح کرے بلکہ معاشرے اور ریاست وحکومت کی بھی اصلاح کرے۔ وہ ایک چینج ایجنٹ ہو جس کے ذریعے سوشل چینج عملاً واقع ہو اور فرد اور معاشرے کی اصلاح لازماً ریاست وحکومت کی اصلاح اور اس کی اسلامیت پر منتج ہو۔ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب اور ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کی یاددہانی کے لیے عرض ہے کہ یہ بالکل وہی بات ہے جو مولانا مودودی نے ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ میں 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟' کے موضوع پر اپنی تقریر میں کی تھی اور جو آج بھی مطبوعہ مل جاتی ہے۔ لیکن مولانا مودودی نے بعد میں تعمیر واصلاح فرد بذریعہ تعلیم وتزکیہ کو اہمیت دینے کی بجائے سیاسی جدوجہد، حصولِ اقتدار اور قیامِ ریاستِ اسلامی کو اپنے پروگرام

میں بنیادی اہمیت دے دی۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کہتے ہیں کہ صرف اصلاحِ فرد سے کچھ نہیں ہوگا جب تک ریاستی اقتدار ایسے اہلِ دین کے پاس نہ ہو جو مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو ردّ کر کے اس کی جگہ اسلامی تعلیمات کو غالب کریں۔ ہم ان کی اس بات سے متفق ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ مولانا مودودی کے تتبع میں یہ کہتے ہیں کہ دینی مقاصد کے لیے حصولِ اقتدار صرف سیاسی جدوجہد سے ممکن ہے اور سیاسی جدوجہد بھی وہ جو مغرب کی کافرانہ اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے 'اسلامی جمہوریت' کے نام سے پاکستان میں مروج ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اسلام اور مغرب کی الحادی کفر وتہذیب اور اس کا کافرانہ نظامِ سرمایہ داری دو مختلف اور متضاد پیراڈائم ہیں اور ان میں جمع وتلفیق ممکن ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ پچھلی ۷۷ سال کی جماعت اسلامی کی سیاسی جدوجہد کی ناکامی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اصول غلط اور ناقابلِ عمل ہے۔

ہم بھی قیامِ اسلامی ریاست کے علمبردار ہیں (مسلمانوں کی ریاست تو موجود ہے، آپ نے اسے عدم سے وجود میں نہیں لانا بلکہ اس میں جو کمیاں کوتاہیاں ہیں ان کی اصلاح کر کے اسے مثالی اسلامی ریاست بنانا ہے۔ اسی طرح آپ نے کافروں کو مسلمان نہیں بنانا بلکہ مسلمان کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں آپ نے ان کی اصلاح کر کے انہیں باعمل مسلمان اور حقیقی مومن بنانا ہے)۔ ہم بھی اسی انقلاب (بڑی تبدیلی) کے داعی ہیں جو نبی کریم ﷺ لائے تھے لیکن ہم کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ انقلاب اس طریقے سے لائے تھے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا تھا (اور وہ قرآن میں چار دفعہ مذکور ہوا ہے[۱]) اور وہ ہے تعلیمِ کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس۔ اس منہج کو استعمال کرتے ہوئے آپ ﷺ نے افراد کی سیرتوں کی تعمیر واصلاح کی۔ پھر انہی مزکیٰ افراد کے ملنے سے اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا اور انہی افراد نے اسلامی ریاست قائم کر لی۔

ہم کہتے ہیں کہ مسلمان تو موجود ہیں، آپ تعلیم وتربیت اور تزکیہ سے ان کی ایسی اصلاح

[۱] البقرہ ۲:۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳:۱۶۴، الجمعہ ۶۲:۲

کردیں کہ وہ تبدیل ہوجائیں، عملاً خدا کے بندے بن جائیں، ایسے انسان جو قرآن کو مطلوب ہوں، جن میں قرآنی صفات ہوں۔ ان کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ اس طرح کریں (جس طرح کہ صحابہؓ کا ہوا تھا) کہ وہ نہ صرف اپنی اصلاح کریں بلکہ اپنے معاشرے کی بھی اصلاح کریں، اپنی ریاست کی بھی اصلاح کریں۔ اور جب بڑی تعداد میں اس طرز پر افراد کی اصلاح ہوجائے گی تو وہ معاشرے کی اصلاح کرکے اسے بھی اسلامی بنالیں گے (کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے) اور وہ ریاست کو بھی اسلامی بنالیں گے (کیونکہ ریاست کو افراد ہی چلاتے ہیں)۔ اس طرح معاشرہ بھی اسلامی ہوجائے گا اور ریاست بھی اسلامی ہوجائے گی۔

ہم سیاسی جدوجہد کے بھی منکر نہیں۔ جب آپ تعلیم وتزکیہ کو بنیاد بنا کر فرد کی تعمیر واصلاح کا کام کرلیں گے (نبی کریم ﷺ نے یہ اصلاحی جدوجہد ۲۳ سال تک کی تھی) تو دیگر شعبوں میں اصلاحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آپ سیاسی اصلاح کے لیے بھی کام کرسکتے ہیں لیکن یہ جدوجہد برائے اصلاح ہوگی، برائے تحفظِ دین واسلامی اقدار ہوگی۔ (موجودہ 'اسلامی جمہورت' میں حصہ لے کر اقتدار حاصل کرکے اس سے 'اقامت دین' اور 'نفاذِ شریعت' مقصود نہ ہوگا) کیونکہ یہ نہ شرعاً ممکن ہے نہ عقلاً جیسا کہ تجربہ اس کا شاہد ہے۔

جہاں تک انقلابِ امامت یا انقلابِ نظام کا تعلق ہے، یہ مقصد بتدریج حاصل ہوتا رہے گا (کُلّی اصلاح کی حکمتِ عملی اور اس کا طریقِ کار ہم طوالت سے بچنے کی خاطر یہاں نہیں دے رہے۔ ہماری بعض دوسری تحریروں میں اس کی تفصیل موجود ہے) تاہم کسی آخری مرحلے پر اگر ضرورت ہو تو اس کے لیے پُرامن سیاسی جدوجہد سے سافٹ انقلاب برپا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ جب عدلیہ، فوج، بیوکریسی اور سیاستدانوں میں آپ کے تربیت یافتہ افراد موجود ہوں گے۔ معاشرے کو چلانے والے طبقوں (بزنس مین، منیجرز، اساتذہ، ڈاکٹرز، انجینئرز وغیرہ) میں بھی آپ کے تربیت زدہ افراد موجود ہوں گے اور وہ وہاں اپنے اپنے شعبوں میں دینی تعلیمات پر عمل (جسے آپ 'نفاذِ اسلام' کہتے ہیں) کی کوششیں کررہے ہوں گے۔ سافٹ انقلاب کا طریق کار جب وقت آئے گا تو اس وقت ضرورت اور

ماحول کے مطابق طے کرلیا جائے گا۔ یہ انتخابات بھی ہو سکتے ہیں، سول نافرمانی بھی، احتجاج اور دھرنے بھی، کچھ اور بھی لیکن جب آپ کو عوام کے ایک بڑے فعال طبقے کی حمایت حاصل ہوگی تو انقلابِ امامت یا انقلابِ نظام کے لیے آپ جو بھی پُرامن طریقہ اختیار کریں گے وہ ان شاء اللہ کامیاب ہوگا۔ اس سافٹ انقلاب کے علمبردار جاہل، نادان اور جذباتی نہیں ہوں گے بلکہ دانا اور اہلِ دانش ہوں گے۔ وہ اپنے حالات کو سمجھتے ہوں گے، ملکی اور بین الاقوامی حالات پر بھی ان کی نظر ہوگی اور وہ اسے اللہ کی نصرت سے کامیاب کرلیں گے۔

اِس وقت مسئلہ یہ ہے کہ صحیح خطوط پر کام نہیں ہو رہا۔ تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کا کام اس طرح جامع اور متوازن انداز میں نہیں ہو رہا جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا تھا۔ لہٰذا موجودہ حالات کی اصلاح کا صحیح طریق کار یہی ہے کہ دینی جدوجہد کا منہاج تبدیل کیا جائے۔ دینی مدارس، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور دیگر دینی قوتوں کو یہ بات سمجھائی جائے لیکن اگر وہ نہ سمجھیں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مجوزہ صحیح خطوط پر کام کرنے کے لیے 'سافٹ انقلاب بذریعہ کلّی اصلاح' کی ایک نئی اصلاحی تحریک اٹھے جو صحیح رُخ میں کام کرے۔ هذا من عندنا والعلم عند الله۔ وآخر دعوانا ان الحمد لله ربّ العلمين۔

بقیہ: مغرب کے خلاف انقلاب ممکن نہیں

(11) Ban opticon دراصل Pan Opticon سے نکلنے والی ایک اصطلاح ہے جس کو Didier Bigo and Anastassia Tsoukala نے اپنی کتاب Terror, Illebral Practices of Liberal Regimes:Insecurity and Liberty After 9/11, London:Routledge 2008. میں استعمال کیا ہے۔ ہان کا یہاں اس اصطلاح کے استعمال سے مقصود یہ ہے کہ آزادی کی کچھ شرائط ہوتی ہیں' ان کو پورا کیے بغیر آزادی نہیں ملتی۔ جو لوگ ان شرائط کو پورا نہیں کرتے اور سرمایہ کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں وہ گویا بعض اعتبارات سے ban کر دیے جاتے ہیں۔

(12) یہ ایک امریکی Vacation rental company ہے' جس کے ذریعہ اپنے گھروں کو سیاحوں کے لیے رینٹ پر دیا جاسکتا ہے۔

اسلام اور پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

دینی جماعتیں اور انتخابات ۲۰۲۴ء

* ہم مغربی جمہوریت کو کفر سمجھتے ہیں اس لیے کہ وہ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور میٹریلزم جیسے الحادی افکار کی پیداوار ہے۔ اس جمہوری نظام میں خدا کی کوئی جگہ نہیں بلکہ یہ انسان مرکز نظام ہے۔ ہم اس کافرانہ جمہوریت میں اسلام کی پیوند کاری سے بننے والی 'اسلامی جمہوریت' کو بھی غلط اجتہادی تعبیر سمجھتے ہیں اور عملاً بھی اس تعبیر کے مطابق جن دینی سیاسی جماعتوں نے پچھلے ۷۷ سال جدوجہد کی ہے، ان کا غیر مؤثر اور ناکام ہونا واضح ہے۔

* ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ متحد ہونے کو تیار نہیں۔ وہ سیکولر سیاسی جماعتوں سے اپنی نشستوں کے مفاد میں تو مفاہمت کرلیتی ہیں لیکن آپس میں سیٹ ایڈجسٹمنٹ کرنے پر بھی تیار نہیں۔ اس کی ایک وجہ ان کی مسلک پرستی بھی ہے۔

* غیر سیاسی اصلاحی جماعتیں اور ادارے (تبلیغی جماعت، دعوتِ اسلامی اور دینی مدارس وغیرہ) حسب معمول انتخابات سے عدم اعتناء کی پالیسی پر کاربند ہیں۔

* لہٰذا ہم نہیں سمجھتے کہ دینی سیاسی جماعتوں کو ان انتخابات میں کوئی بڑی کامیابی ملے گی۔ وہی پرانی طرز پر جماعتِ اہلِ حدیث، جماعتِ اسلامی اور تحریکِ لبیک کو دو تین نشستیں اور جمعیت علماء اسلام (ف) کو آٹھ دس نشستیں ملنے کی توقع ہے۔ کوئی اَپ سیٹ ہو جائے تو الگ بات ہے، اس کی توقع تو نہیں۔

* جہاں تک پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کا تعلق ہے، ان سے پاکستانی اتنی بار ڈسے جا چکے ہیں کہ ان سے خیر کی کوئی توقع نہیں۔ تحریک انصاف بھی پچھلی دفعہ ڈیلیور نہیں کرسکی تھی تاہم مذکورہ دونوں جماعتوں کے مقابلے میں اس سے خیر کی کچھ توقع باقی ہے۔

* ملک میں سیاسی و معاشی عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ فوج کنگ میکر کی پوزیشن سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اس دفعہ وہ مسلم لیگ ن کو آگے لا رہی ہے اور تحریک انصاف معتوب ہے۔ نیز وہ مغربی آقاؤں کی ناراضی برداشت کرنے کی بھی متحمل نہیں۔ اسلام اور اسلامی نظامِ زندگی بھی اس کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ ان حالات میں پاکستان کے سیاسی استحکام اور غریب پاکستانیوں کی مشکلات کم ہونے کی دعا ہی کی جاسکتی ہے۔

اسلام اور پاکستان قاضی حسین احمد

کیا فوج کا تربیتی نظام استعمار کی وراثت پر مبنی ہے؟

قاضی حسین احمد کی ۲۰۰۸ء کی ایک چشم کشا تحریر

پشاور کے ایک بڑے گراؤنڈ میں فرنٹیر کور رجمنٹ کی سوسالہ تقریب میں صوبہ سرحد سے ممبر سینٹ کی حیثیت سے مَیں بھی شریک تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر فرنٹیر کور رجمنٹ کا تعارف پیش کیا جا رہا تھا اوران کے کارناموں کے بارے میں شرکاء کوآگاہ کیا جارہا تھا۔ گراؤنڈ کے اندر پریڈ ہو رہی تھی۔ سب سے آگے مہمند رائفلز کا ایک دستہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے زمانے کا یونیفارم پہنے ہوئے جارہا تھا۔ سپاہیوں نے گھٹنے سے نیچے تک لٹکے ہوئے جانگیے پہنے ہوئے تھے اوران کی داڑھیاں ایک قبضے سے بڑھی ہوئی سنت رسول کے مطابق تھیں۔ ہاتھوں میں اس زمانے کی جدید ترین رائفل تین سوتین (303) یا تھری ناٹ تھری پکڑے ہوئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ دستہ فرنٹیر کور رجمنٹ کا پہلا دستہ تھا۔ ان کے بعد دوسرے دستوں کا تعارف بھی کرایا گیا جنھوں نے اپنے دور میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے۔ پریڈ کے خاتمے پر چائے کی تقریب تھی۔ تقریب میں ان بوڑھے ریٹائرڈ برطانوی افسروں سے بھی ملاقات ہوئی جو خاص طور پر اس تقریب میں شرکت کے لیے برطانیہ سے بلائے گئے تھے اور جنھوں نے اپنی جوانی میں فرنٹیر کور کے مختلف دستوں کی کمان کی تھی۔

مَیں نے فرنٹیر کور کے ایک سینئر افسر سے پوچھنے کی جسارت کی کہ یہ مہمند رائفلز جو آپ کی فرنٹیر کور رجمنٹ کا پہلا دستہ تھا اور پہلا دستہ ہونے کی وجہ سے جن کے کارناموں کو آج بھی آپ لوگ یاد کرتے ہیں، کن لوگوں کے خلاف نبرد آزما تھا؟ پاکستانی افسر میرا مدعا سمجھ گئے، اس لیے میرے سوال کا سیدھا جواب دینے کے بجائے گریز کرنے لگے تو مَیں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہی وہ لوگ نہیں تھے جو آزادی کے عظیم مجاہد اور تحریکِ اصلاحِ افاغنہ کے بانی عظیم مصلح حاجی صاحب ترنگزئی کے خلاف مہمند کی پہاڑیوں میں انگریزوں کی طرف سے لڑ رہے تھے؟ وہ کھسیانے ہو گئے۔ مَیں نے پھر ان سے پوچھا کہ کیا ہم حاجی صاحب ترنگزئی کو اپنا ہیرو سمجھیں یا فرنٹیر کور کے اس پہلے دستے مہمند رائفلز کو اپنے لیے مثال بنائیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ

ہماری تاریخ ہے۔

کچھ دن بعد صوبہ سرحد کے گورنر ہاؤس میں میری ملاقات اُس وقت کے گورنر ریٹائرڈ میجر جنرل خورشید علی خان سے ہوئی۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ پاکستانی فوج دور برطانیہ کی اپنی روایات کو برقرار رکھنے پر کیوں مصر ہے؟ انھوں نے بے تکلفی سے بتایا کہ ہمیں تو اپنے فوجی یونٹ کی پوری تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور اس میں یہی درج ہوتا ہے کہ "دشمن" کا ہم نے کس طرح پیچھا کیا اور "دشمن" نے کیا کیا طریقے اختیار کیے اور ہم نے کس طرح دشمن کے ہتھکنڈوں کا توڑ کیا۔ یہ "دشمن" حاجی صاحب ترنگزئی یا اسی طرح کے دوسرے انگریز دشمن مجاہد ہی تھے اور ہمارے یونٹ ان کے خلاف نبرد آزما تھے۔ یہ ہماری روایات اور ہماری تاریخ ہے اور پاکستانی فوج ان روایات کی وارث ہے۔

ہمارے مسائل کی جڑ یہی ہے کہ برطانوی راج نے ہندوستان میں جو اینگلو سیکسن (Anglo Saxon) نظام قائم کیا اور جس نظام کے تحت انھوں نے مقامی باشندوں پر حکمرانی کی، اس نظام کو قائم رکھتے ہوئے برطانوی سامراج کی وارث انتظامیہ (Establishment) اب تک عوام پر حکمران ہے۔

یہ انتظامیہ نہ صرف برطانیہ اور سامراجی ممالک کی تہذیب وتمدن کی محافظ ہے بلکہ ان کے معاشی مفادات کی بھی نگران ہے۔ برطانوی سامراج نے جانے سے پہلے یقینی بنالیا تھا کہ نام نہاد آزادی کے باوجود ان کے بعد ان کی قائم کردہ انتظامیہ کی مضبوط گرفت برقرار رہے۔ ان کی زبان، ان کی ثقافت اور ان کی تہذیب پھلتی پھولتی رہے اور ان کے معاشی مفادات محفوظ رہیں۔ چنانچہ آزادی کے 61 سال گزرنے کے بعد[۱] ہم اپنی زبان سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ اقبال کا فارسی کلام ایران، وسط ایشیا اور افغانستان میں تو سمجھا جا سکتا ہے لیکن پاکستانی قوم اس سے قطعاً نابلد ہو چکی ہے بلکہ اب تو اردو سے بھی نئی نسل نا آشنا ہو رہی ہے۔ جب ہم کہیں بات کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ذرا آسان اردو میں بات کریں، مطلب یہ کہ انگلش نما اردو میں بات کی جائے۔ اپنی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے ہماری نئی نسل ندرت خیال

[۱] یہ غالباً ۲۰۰۸ء کی بات ہے

(Original Thinking) سے محروم ہو رہی ہے اور ہم محض نقالوں کی قوم بن رہے ہیں۔

چند سال قبل ملا کنڈ ایجنسی کے ایک گاؤں ”ملا کنڈ“ کے باشندوں نے مجھ سے شکایت کی کہ ملا کنڈ کئی نسلوں سے ہمارا گاؤں ہے۔ اس کی مٹی میں ہمارے آباؤ اجداد کی ہڈیاں ملی ہوئی ہیں، مگر اب پاکستانی فوج ہمیں اپنے گاؤں سے بے دخل کرنا چاہتی ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ ہم نے 1887ء میں اس علاقے کو فتح کیا تھا، اس لیے یہ ہمارا مفتوحہ علاقہ ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ پاکستان کی وزارت دفاع نے ایک خط میں انھیں یہ لکھ دیا تھا کہ ہم نے اس علاقے کو 1887ء میں فتح کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستانی فوج آج بھی اپنے آپ کو برطانوی سامراج کی وارث سمجھتی ہے اور ان کے مفتوحہ علاقوں کو اپنا مفتوحہ علاقہ قرار دیتی ہے۔

اپنی اس تربیت کی بنا پر پاکستانی فوج کو امریکی فوج کے حلیف کے طور پر اپنی ہی قوم کو سوات، باجوڑ، مہمند، وزیرستان، قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں بم باری اور گولہ باری کا نشانہ بنانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔ اس وقت لاکھوں لوگ اپنی ہی فوج کے ہاتھوں اپنے گھروں سے باہر نکالے گئے ہیں اور سخت سردی میں کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم تین نسلوں سے سپاہیانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ ”سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری“ یہ کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی دو نسلوں نے برطانوی سامراج کی خاطر امت مسلمہ کی مرکزیت کی آخری نشانی خلافت عثمانیہ کے خاتمے میں کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ سرزمین حجاز پر بھی برطانوی سامراج کو مسلط کرنے میں پیش پیش رہے اور بیت اللہ پر گولیاں چلانے سے بھی باز نہیں آئے۔

پاکستانی فوج کا ہر یونٹ اپنے ڈانڈے رائل انڈین آرمی سے ملاتا ہے، جنگِ عظیم اول کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے، جنگِ عظیم دوم میں جن جن محاذوں پر انھوں نے خدمات سرانجام دی ہیں اور بہادری کے جو تمغے انھیں ملے ہیں، فخر یہ انداز میں ان کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑتا ہے۔

14 اگست 1947ء کا دن ان کی تاریخ میں کسی آزادی اور انقلاب کے دن کے بجائے برطانوی سامراج کی وراثت کو اپنانے کا دن ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک بیٹا سن رشد کو پہنچنے کے بعد اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھال لیتا ہے۔ اس دن ہماری فوج رائل انڈین آرمی کی

بجائے رائل پاکستان آرمی بن گئی تھی۔ ہماری نیوی رائل پاکستان نیوی اور ہماری ائیرفورس رائل پاکستان ائیرفورس بن گئی۔ سامراجی دور کی روایات آج بھی اسی طرح محفوظ ہیں اور اگر تھوڑی بہت تبدیلی آئی تھی تو پرویز مشرف کے دور میں امریکہ کا حلیف بن کر اس تبدیلی پر پانی پھیر دیا گیا اور ہماری فوج کو پھر سے کرائے کی فوج بنا دیا گیا ہے۔ جو پاکستانی قوم اور امت مسلمہ کے مفادات کے بجائے امریکی سامراج کے مفادات کی محافظ ہے۔

اس کے باوجود ہمارے آرمی چیف توقع رکھتے ہیں کہ پاکستانی قوم فوج کے ساتھ تعاون کرے کیونکہ قوم کے تعاون کے بغیر فوج وطن کے دفاع کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتی۔قوم پوچھتی ہے کہ سوات، باجوڑ، مہمند، وزیرستان اور بلوچستان میں کارروائیاں کر کے کیا فوج وطن کے دفاع کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے؟ پوری دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کی خواہش میں امریکہ نے اسلام اور عالم اسلام کے خلاف جو جنگ برپا کر رکھی ہے اس کی زد میں فلسطین، عراق اور افغانستان کے بعد اب پاکستان اور ایران بھی آرہے ہیں۔

قبائلی علاقوں پر مسلسل بمباری کی وجہ سے لاکھوں لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر وطن کے اندر ہی بے وطن ہورہے ہیں۔ان اندرونی طور پر بے گھر ہونے والوں کے لیے(Internally Displaced People[IDP]) کی اصطلاح وضع کی گئی ہے اور اب ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔قبائلی علاقوں میں ان ظالمانہ کارروائیوں کی وجہ سے ردعمل پھیل رہا ہے۔ان علاقوں میں اب تک علیحدگی کا کوئی رجحان نہیں ہے نہ ہی ان علاقوں میں پاکستان دشمن عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہورہا ہے کہ ایک منصوبے کے تحت یہ جذبات پیدا کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔

مہمند ایجنسی پرامن تھی مگر ایک سازش کے تحت باجوڑ، وزیرستان، کرم اور خیبر کے بعد ایک اور ایجنسی میں ملک دشمنی اور فوج کے خلاف نفرت کے بیج بوئے جارہے ہیں۔20اکتوبر سے وہاں کرفیو نافذ ہے، راستے بند ہیں، لوگوں کو ہجرت کے لیے بھی راستہ نہیں دیا جارہا۔ پوری ایجنسی میں اشیائے خوردونوش کی شدید قلت ہے جس سے لاکھوں افراد کے بھوک سے مرنے کا خطرہ ہے۔ یکہ غونڈ تحصیل میں ہونے والے فوجی آپریشن میں کس کور، ظریف کور، عائشہ کور سمیت درجنوں علاقے گولہ باری کی زد میں ہیں، عام آبادی پر مارٹر گولے

برسائے جارہے ہیں، بھاری توپخانے کا استعمال کیا جارہا ہے اور ہیلی کاپٹرز سے شیلنگ کی جارہی ہے۔ اسکولوں اور طالب علموں کو نشانہ بنایا جارہا ہے، راستے میں کھڑے لوگوں اور دریا پار کرنے والوں پر بھی شیلنگ کی جاتی ہے۔ 16 نومبر سے ایجنسی کے علاقے قندارو میں بھی آپریشن شروع کردیا گیا ہے۔ فوجی آپریشن اب پشاور کے قرب وجوار تک آپہنچا ہے اور پشاور کی جوگئی یونین کونسل کے گاؤں سرخنی میں مارٹر کا گولہ گرنے سے ایک شخص جھلس کر جاں بحق ہوا، بیوی کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے اور بچے شدید زخمی ہوئے۔

امریکی ڈرون طیارے قبائلی علاقوں سے بڑھ کر اب شہری علاقوں پر حملہ آور ہیں اور بنوں میں ایک گھر کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ ادھر سوات میں گن شپ ہیلی کاپٹرز اور بھاری توپوں کا استعمال ہورہا ہے۔ تحصیل کبل میں دو ہفتوں سے شدید گولہ باری ہورہی ہے۔ عمر بھر خلیج کے ممالک میں محنت مزدوری کرکے غریب لوگوں نے اپنے اہل خانہ کے لیے جو سرمایہ فراہم کیا تھا، وہ پاکستان کی اپنی فوج کے ہاتھوں ختم ہوچکا ہے۔ لوگوں کو 2 گھنٹے کے نوٹس پر مکانات خالی کرنے کا آرڈر ملتا ہے اور لوگ سراسیمگی کی حالت میں گھروں کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اور مکانات زمین بوس کردیے جاتے ہیں۔ بیشتر حالات میں بے گناہ لوگوں کے مکانات مسمار کرنے کے بعد فوجی اہلکار معذرت پیش کرتے ہیں لیکن اس سے دلوں کے زخم نہیں بھرے جاسکتے۔

یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ جو لوگ پاکستان کو اسلام کا قلعہ سمجھتے ہیں اور اس کی حفاظت کو دین کی حفاظت کے برابر سمجھتے ہیں ان کو انتہا پسند (Extremists)، عسکریت پسند (Militants) اور دہشت گرد (Terrorists) قرار دیا جارہا ہے اور جو لوگ پاکستان کو انگریزی سامراج کی سازش کا نتیجہ اور پنجابی استعمار کا دوسرا نام قرار دیتے رہے ہیں، انہیں اعتدال پسند، روشن خیال اور امن پسند قرار دے کر ملک کا تیا پانچہ کرنے کی سازش پر عمل ہو رہا ہے۔ اس سازش کو ناکام بنانے کا واحد راستہ عوام کی بیداری ہے۔ عوام کو آگاہی دے کر ایک عوامی جدوجہد کے ذریعے ہی ان سازشوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

مراعت یافتہ طبقے سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کے لیے کوئی قربانی دیں گے۔ یہ لٹیروں کا طبقہ ہے ان سے پاکستان بچانے کے لیے عوام الناس کو اٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔

تفہیم مغرب

مکرم محمود

بدلتے مغربی نظام کی تفہیم کے بغیر
مغرب کے خلاف انقلاب ممکن نہیں

جدیدیت کے کلی اور ہمہ گیر تسلط اور غلبہ کے بعد جن نئے مباحث و مسائل نے جنم لیا ان میں سے ایک نظام یا سسٹم کا مسئلہ ہے۔ نظاموں کا غلغلہ اور نظاماتی مباحث ایک خاص تاریخی دور کے نتائج ہیں اور اپنا جواز بہم رکھتے ہیں۔ اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ نظام یا سسٹم کی حقیقت و ماہیت اور اس کی حاضر و موجود ہیئت و ساخت کی معرفت ہر طرح کے عمل و مزاحمت سے قبل ضروری ہے۔ انقلاب کا شوق تو آپ سے کچھ تقاضا نہیں کرتا لیکن انقلاب کا ذوق ندرتِ فکر و عمل کا طالب ہے۔ اس بحث کو ہم بعد کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ آغاز میں Byung Chul Han (بیان چل ہان کا تفصیلی تعارف حواشی میں موجود ہے)[(1)] کے ایک مضمون "Why Revolution is Impossible Today?" کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ فلسفی عہد حاضر میں Late/Hyper Capitalism, Neo-Liberalism, Digital Technologies کے نتیجے میں ہونے والی نظاماتی تبدیلیوں اور انسانی صورتحال میں واقع ہونے والے تغیرات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہاں اس ترجمہ کا مقصد اس کی ہر بات سے اتفاق کو ظاہر کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود اس مبحث کو ہمارے ہاں از سر نو اٹھانا ہے[۱] اور یہ جاننا ہے کہ اس کے نزدیک ہمارے عہد میں ایسی کیا کایا پلٹ ہوئی اور ایسی کونسی رکاوٹیں ہیں کہ اب کلی نظاماتی تحول روایتی تفہیم و طریقے پر ممکن نہیں۔ جیسا کہ اس ترجمہ کے بعد واضح کیا جائے گا کہ چونکہ سسٹم مسلسل ایک تغیر کے عمل سے گزر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی تفہیم مسلسل غور و فکر، مشاہدہ، مطالعہ اور نظری سرگرمی کی محتاج ہے۔ جدیدیت کے تناظر میں اس کے سیاق و سباق اور ہماری لوکل صورتحال پر اس کے اطلاقات اور سسٹم کے کلی تحول اور اس کے سامنے مزاحمت کے مناہج پر

---

[۱] از سر نو اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ پچھلی صدی میں جتنی بھی انقلابی تحریکات اٹھی ہیں، دینی ہوں یا لادینی، وہ جس نظام کو بدلنے کی خواہش مند ہیں، وہ سسٹم یا نظام کیا ہے کے سوال کا کوئی نہ کوئی جواب واضح طور پر اپنے بیان میں یا اپنے تصوّرات میں ایک پوشیدہ مفروضے کے طور پر لازمی رکھتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ انھی بیانات یا مفروضوں پر ابھی تک معاملات جاری و ساری ہیں اور سسٹم کے تقلبات و تغیرات پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

ہماری دینی تحریکات کے تناظر میں مختصر اصولی گفتگو اس ترجمہ کے بعد کی جائے گی۔

ذیل میں اب ترجمہ دیا جارہا ہے۔حواشی میں اہم تصوّرات کی وضاحت کردی گئی ہے۔

Why Revolution is Impossible Today?

This was first published in Suddeutsche Zeitung, 3 September 2014)

یہ اصلاً جرمن زبان میں ہے۔ یہ ترجمہ اس کے انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے)

’’حال ہی میں میرے اور Antonio Negri(2) کے درمیان برلن میں ہوئے ایک مکالمہ میں سرمایہ داریت پر تنقید کے دو مناہج گویا آمنے سامنے آ گئے۔ Negri اس غالب نیو لبرل سسٹم کے خلاف عالمگیر مزاحمت کے امکان کے بارے میں پراُمید تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کمیونسٹ انقلابی کی حیثیت سے پیش کیا اور مجھے ایک ’تشکیک زدہ پروفیسر‘ قرار دیا۔ اس نے اصرار کے ساتھ انقلابیوں کی مربوط اجتماعیت (3) (multitude) اور مزاحمتی گروپس کی اہمیت کو اُجاگر کیا بظاہر اس یقین کے ساتھ کہ یہ انقلابی اجتماعیت سسٹم کے انہدام کا باعث بن سکتی ہے۔ میرے خیال میں کمیونسٹ انقلابیوں کی یہ پوزیشن کہیں نہ کہیں حقائق سے دوری یا سادہ فکری کا شاخسانہ ہے۔تو میں نے کوشش کی کہ Negri کو یہ سمجھاؤں کہ عصرِ حاضر میں انقلاب کیوں ممکن نہیں!

سوال یہ ہے کہ نیولبرل سسٹم (4) اتنا مستحکم کیوں ہے؟ اس کے خلاف مزاحمت کی کمی کی وجہ کیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اگر کوئی مزاحمت پیدا بھی ہوتی ہے تو جلد ہی تحلیل ہو جاتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ غریب اور امیر کے درمیان بڑھتی تفریق کے باوجود انقلاب ممکن نہیں؟ ان تمام باتوں کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہمیں اس بات کا فہم حاصل ہو کہ اس دور میں طاقت اور حکومت کیسے عمل کرتے ہیں۔

کسی بھی نئے نظامِ حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مزاحمت کے تمام دروازوں کو بند کیا جائے۔ یہ بات نیولبرل سسٹم کے لیے بھی درست ہے۔ ایک نئے سسٹم کو کھڑا کرنے کے لیے ایک ’’اقدامی طاقت‘‘ کی احتیاج ہوتی ہے اور اقدامی طاقت میں اکثر تشدد متضمن ہوتا ہے۔ مگر یہ اقدامی طاقت اس طاقت سے مختلف ہے جو سسٹم کو داخلی استحکام عطا کرتی ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ مارگریٹ تھیچر جو نیولبرلزم کی ابتدائی علمبرداروں میں سے

تھی، نے ٹریڈ یونینز کو آستین کا سانپ قرار دیا اور پُرتشدد طریقوں سے ان کے خلاف لڑی۔ مگر پُرتشدد طریقوں سے نیولبرل سسٹم اور ایجنڈا کا اثبات، نفاذِ سسٹم کی ''حفاظتی طاقت'' سے بالکل ایک الگ چیز ہے۔

ڈسپلنری سسٹم اور صنعتی معاشروں کی ''حفاظتی طاقت'' زور زبردستی کی قائل تھی۔ صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا واضح استحصال ہوتا تھا اور یہ پرتشدد استحصال صنعتوں کے مالکوں کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کو جنم دیتا تھا۔ اس صورتحال میں ایک ایسے انقلاب کا امکان واضح طور پر ہوتا تھا جو موجودہ غالب پیداواری تعلقات کو اُلٹ کر رکھ دے۔ اس نظام میں استحصال کرنے والوں اور جن کا استحصال ہوتا تھا ان کی تفریق بالکل واضح تھی۔ مدِّ مقابل متعین اور دشمن سامنے تھا جو مزاحمت کا ہدف قرار پاتا تھا۔

نیولبرل سسٹم اپنی ساخت میں ایک بالکل مختلف نظام ہے۔ سسٹم کی ''حفاظتی طاقت'' زور زبردستی کے بجائے لبھانے کی قائل ہے۔ ڈسپلنری سسٹم میں ''حفاظتی طاقت'' جس طریقے سے سامنے ہوتی تھی نیولبرل سسٹم میں ایسا نہیں ہے۔ واضح طور پر اب کوئی متعین مدمقابل نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے جو لوگوں کو ان کی آزادی سے محروم کر رہا ہو۔ کوئی زور زبردستی کرنے والا نہیں ہے کہ اس کے خلاف مزاحمت کی جائے۔ دبے ہوئے کام کرنے والے کی جگہ نیولبرل سسٹم نے ایک آزاد انٹرپرینور کو تخلیق کیا ہے جو اپنی ذات کا انٹرپرینور(5) (Entrepreneur of the self) ہے۔ آج کل ہر کوئی اپنے کام کے دائرے میں اپنا استحصال خود کرنے والا مزدور ہے۔ ہر کوئی اپنی ذات میں آقا اور غلام ہے۔ طبقاتی کشمکش کو داخلی نفسی کشمکش میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ناکام لوگ اپنی ناکامی کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہراتے ہیں(6) اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ اپنی ناکامیوں اور دوسرے مسائل کا ذمہ دار وہ سسٹم یا معاشرے کے بجائے اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

ڈسپلنری طاقت جو لوگوں کو کچھ کرنے اور کچھ نہ کرنے یعنی اوامر ونواہی کا پیچیدہ نظام العمل فراہم کر کے قوت کے ذریعے کنٹرول کرتی ہے، درحقیقت کارگر نہیں (Inefficient) ہے۔ کہیں زیادہ کارگر طاقت کا وہ اسلوب ہے جو لوگوں کو رضاراکارانہ طور پر اپنے آپ کو سسٹم کے سامنے جھکا دینے کو یقینی بنائے۔ اس طریقۂ کار کے غیر معمولی طور پر کارگر ہونے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ یہ طریقہ لوگوں کو محروم کر دینے اور روک ٹوک کے ذریعے نہیں بلکہ لذت اور

احساسِ تکمیل کے ذریعے کام کرتا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو شائستہ اور مہذب بنانا نہیں بلکہ لوگوں کو سسٹم کا اسیر بنانا ہے۔ یہ نیولبرل منطق نگرانی کے نظام پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ ۱۹۸۰ء کے زمانے میں تو لوگوں نے مردم شماری کے خلاف بھی احتجاج کیا یہاں تک کہ سکول کے بچے بھی سڑکوں پر آ گئے تھے۔ آج کل کے حالات میں مردم شماری کے ضمن میں فرد کے کام، اہلیت اور گھر کے درمیان فاصلے سے متعلق معلومات فراہم کرنا ایک بالکل بے ضرر عمل معلوم ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ لوگوں کو محسوس ہوتا تھا کہ ریاست اور اس کے ادارے ان کے مدِ مقابل ہیں جو شہریوں کے بارے میں ان کی مرضی کے خلاف معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت کو گزرے ہوئے عرصہ بیت گیا۔ اب ہم اپنی مرضی سے اپنے آپ کو بے نقاب کرتے ہیں۔ آزادی کا یہی احساس ہے جو (سسٹم کے خلاف) احتجاج کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ ۸۰ء کی دہائی میں لوگ مردم شماری کے خلاف احتجاج کرتے تھے اور آج ہم نگرانی (surveillance) کے اس نظام کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کرتے۔ خود سے اپنی نقاب کشائی کرنا اور اپنے آپ کو ظاہر کرنا اسی اصول کے کارگر ہونے کا نتیجہ ہے جس اصول نے آزاد مرضی سے خود استحصالی کو ممکن بنایا تھا۔ ہم کس کے خلاف احتجاج کریں؟ کیا اپنے خلاف؟

امریکہ کی ایک تصوّراتی آرٹسٹ Jenny Holzer نے اس عجیب صورتحال کو اپنے ایک قول truism میں اس طرح بیان کیا ہے کہ Protect me from what I want
''میری حفاظت کیجیے اس سے جو میں چاہتا/ چاہتی ہوں۔''

اقدامی اور حفاظتی طاقت میں فرق کرنا بہت ضروری ہے۔ سسٹم کی حفاظتی طاقت نے ایک بہت لطیف اور دوستانہ لبادہ اوڑھ لیا ہے اور اس وجہ سے جیسے وہ غیاب میں ہے اور اس پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ نفسِ محکوم کو اپنی محکومیت کا احساس بھی نہیں۔ وہ اپنی آزادی پر یقینِ کامل رکھتا ہے۔ حکومت کا یہ طریقۂ کار مزاحمت کو ختم کرنے میں نہایت مؤثر ہے۔ وہ سسٹم جو لوگوں کو دبائے اور (واضح طور پر) ان کی آزادی کو محدود کرے مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس نیولبرل سسٹم کے مستحکم اور ناقابلِ تسخیر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کو دبانے کے بجائے آزادی کو (اپنے مقاصد کے لیے) استعمال کرتا ہے۔ آزادی میں رکاوٹ پیدا کرنا مزاحمت کو جنم دیتا ہے جبکہ آزادی کے (خفیہ) استحصال میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایشیا میں جب مالیاتی بحران آیا تو ساؤتھ

کوریا کی معیشت کو جھٹکا لگا اور جیسے وہ فالج زدہ ہوگئی۔تب IMF آیا اور بیل آؤٹ فراہم کیا۔ اس کے نتیجے میں حکومت کو نیولبرل اصلاحات کو نافذ کرنا تھا اور اس کے نتیجے میں ہونے والے احتجاجات کو طاقت سے روکنا اور دبانا تھا۔ یہ جو دبانے والی طاقت ہے یہ (سسٹم کی) اقدامی طاقت ہے اور اس میں قوت کا (واضح) استعمال کیا جاتا ہے۔مگر یہ اقدامی طاقت سسٹم کی حفاظتی طاقت سے بالکل مختلف چیز ہے‘ جو کہ نیولبرل حکومت میں اپنے آپ کو آزادی کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔[7] Naomi Klein کے خیال میں ساؤتھ کوریا اور یونان ایسے معاشرے جب مالیاتی بحران کے بعد ”جھٹکے“ (State of shock) کی حالت میں ہوتے ہیں تو یہ بہترین موقع ہوتا ہے کہ ان ملکوں کی زبردستی ری پروگرامنگ کی جائے۔ساؤتھ کوریا میں ان اقدامات کے خلاف کوئی صحیح مزاحمت نہیں ہے۔اس کے بجائے عمومی اتفاقِ رائے اور موافقت پائی جاتی ہے‘ مگر اس کے ساتھ ڈیپریشن اور برن آؤٹ[8] بھی پایا جاتا ہے۔ساؤتھ کوریا میں خودکشی کا رجحان دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔معاشرے کو بدلنے کی بجائے لوگ خود اپنے اوپر تشدد کرتے ہیں۔غصے کا خارجی اظہار جو بنائے انقلاب بن سکتا تھا اب اپنے اوپر جارحیت میں بدل چکا ہے۔

کوئی ایسی مربوط اور معاون اجتماعیت نہیں ہے جو عالمی مزاحمتی تحریک یا انقلابی جماعت کا کردار ادا کر سکے۔ پیداوار (اشیاء‘ معلومات‘ تصاویر) کا جو موجودہ نظام ہے وہ تنہا‘ سب سے الگ‘ غیر متعلق‘ اپنے آپ کا کاروبار کرنے والے نفس پر کھڑا ہے۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ہر انٹرپرائز کے اندر ایک اتحاد ہوتا تھا‘ اگرچہ تمام انٹرپرائز آپس میں مسابقت کرتی تھیں۔اب ہر فرد دوسرے فرد کے ساتھ مسابقت میں ہے ایک ادارے کے اندر بھی۔ یہ عالمی مسابقت کا نظام پیداوار کے لیے نہایت سودمند ہے مگر یہ یکجہتی اور انسانی اجتماعیت کو غارت کر دیتا ہے۔ ڈیپریشن کا شکار اور ایک دوسرے سے غیر متعلق افراد سے انقلابی گروہ جنم نہیں لے سکتا۔

نیولبرلزم کو عام مارکسی اصطلاحات میں بیان نہیں کر سکتے۔ یہ ”کام سے بیگانگی“ (Alienation)[9] والے مشہور تصوّر کو بھی ظاہر نہیں کرتا۔ہم پوری آمادگی کے ساتھ اپنے آپ کو کام میں جھونکتے ہیں، یہاں تک کہ ہم برن آؤٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ جوش ہی دراصل برن آؤٹ کا پہلا درجہ ہے۔ برن آؤٹ اور انقلاب باہم یک نگر (mutually

exclusive) ہیں۔ تو اس بات پر یقین کرنا غلط ہے کہ ''اجتماعیت'' (Multitude) اس نظام کو اُٹھا کر پھینک دے گی اور کمیونسٹ معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

کمیونزم کی موجودہ صورتحال کیا ہے؟ سماج اور اشتراک کا بڑا چرچا ہے۔ خیال ہے کہ 'اشتراک کی معیشت' پراپرٹی اور ملکیت کی معیشت کی جگہ لے رہی ہے۔ ''چیزیں شیئر کرنا اور بانٹنا ہی ایک دوسرے کا خیال کرنا ہے۔'' یہ Dave Eggers کے ناول The Circle میں circlers کا ایک بنیادی اصول ہے۔ ہر کال کمپنی کے مرکزی دفتر کے راستے میں سڑک کے کنارے پتھروں پر یہ نعرے کندہ کیے گئے تھے کہ اجتماع کا حصہ بنو، شمولیت اختیار کرو۔ مگر حقیقت میں نعرہ یہ ہونا چاہیے ''خیال کرنا (caring) مار دینا ہے۔'' سواریوں کو شیئر کرنے کا آن لائن پلیٹ فارم 'Wonder Car' جو ہم میں سے ہر ایک کو ٹیکسی ڈرائیور بنا دینا چاہتا ہے، اپنی اشتہار بازی میں سماج اور اجتماعیت کے تصوّر ہی کو استعمال میں لاتا ہے۔ مگر اس اشتراک کی معیشت کی آمد نے سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کا آغاز نہیں کر دیا اور نہ ہی انسانوں کا کوئی عالمی معاشرہ وجود میں آنے جا رہا ہے، جس میں چیزوں کو شیئر کرنے کی قدر ان کی ملکیت سے زیادہ اہمیت حاصل کر جائے، جیسا کہ Jeremy Rifkin نے اپنی کتاب (10) Zero Marginal Cost Society میں بیان کیا ہے۔ اس کے بالکل برعکس اشتراک کی معیشت بالآخر زندگی کے ہر گوشے کو بازار کے زیرِ اثر لانے کا باعث بنے گی۔

ملکیت (ownership) سے دسترس (access) کی جانب تبدیلی جس کو Rifkin بہت خوش آئند جانتا ہے ہمیں درحقیقت سرمایہ داری کے چنگل سے آزاد نہیں کر سکتی۔ جس کے پاس پیسہ نہیں ہوگا شیئرنگ بھی اس کی دسترس میں نہیں ہوگی۔ اس عہدِ دسترس (Age of access) میں بھی ہم (11) Ban opticon میں جیتے ہیں۔ جن کے پاس پیسہ نہیں ہوگا وہ دائرہ سے باہر ہی رہیں گے۔ (12) Air Bnb ایسا معاشرتی بازار ہے جو لوگوں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ اپنے گھروں کو ہوٹل بنا لیں جو مہمان نوازی کو بھی ایک معاشی سرگرمی میں بدل دیتی ہے۔

معاشرت اور انسانی اجتماعیت کا تصوّر (اس دور میں) اجتماعیت اور معاشرت کو بھی جنسِ بازار بنا دیتا ہے۔ سادہ' بے غرض دوستی ناممکن ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں ایک دوسرے کے ''ریٹ'' لگائے جاتے ہیں دوستی بھی کمرشل ہو گئی ہے۔ لوگ نرم اور دوستانہ رویّہ کا اظہار

کرتے ہیں تا کہ ان کی ''ریٹنگ'' بہتر آئے۔'اشتراک پر مبنی معیشت' کے دل میں بھی سرمایہ دارانہ بے لگام منطق ہی کی حکومت ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ''شیئرنگ'' کی ان باتوں کے باوجود کوئی اپنی چیز نہیں دیتا۔ جب سرمایہ دارانہ نظام نے ''کمیونزم'' کو ہی جنسِ بازار بنا کر بیچنا شروع کر دیا ہے تو اس سے آگے کی بات بھلا کیا ہوگی؟ ''کمیونزم'' کو جنسِ بازار بنا دینے میں کامیابی ہر قسم کے انقلاب کا بیج مار دینے کے لیے کافی ہے''۔ (ترجمہ ختم ہوا)

چند معروضات

ہم ایک ایسے عہد میں جیتے ہیں جو اپنی تشکیلی ساخت میں متعدد عناصر وعوامل کا ماحصل اور مرہونِ منّت ہے۔ کچھ عوامل وعناصر تاریخی ہیں اور ماضی بعید سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ عناصر کو ظہور پذیر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں بیتا۔ اول الذکر تو علم و تحقیق، بحث ومباحثہ اور تجزیہ و تنقید کا موضوع ایک مخصوص حلقے کی طرف سے بنتے رہے ہیں مگر ثانی الذکر پر توجہ نسبتاً کم نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ جو ہم عصر دنیا، اس میں پائے جانے والے نظام اور انسانی صورتحال کو موضوع بناتے ہیں ان کے ادراک اور تجزیہ میں ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ مُدرَک کے کچھ زود اثر تشکیلی عناصر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا جتنی توجّہ کی احتیاج تھی اتنی توجّہ نہیں دی جاتی۔ تاریخی عناصر میں روم و یونان کا کردار، قرونِ وسطیٰ میں پائے جانے والے کچھ باطل عقائد اور غیر مناسب اور پُر تشدد عمل، احیائے علوم، روشن خیالی، عقلیت اور اصلاح مذہب کی تحریکیں، سائنسی انقلاب، صنعی انقلاب، انقلابِ فرانس وغیرہ ہیں جو تمام جغرافیائی طور پر یورپ مرکز ہیں۔ ان تمام عناصر کے مجموعی نتائج کو ہم بعنوان ''جدیدیت'' معنون کرتے ہیں جس کی علمیت' مابعد الطبیعیات اور اقدار ماضی کی اکثر روایتوں سے نسبت تضاد رکھتی ہیں۔ اسی کے نتیجے میں ایک جدید انسان نے جنم لیا جو اپنے تئیں خود آگاہ مگر حقیقتاً خود و خدا فراموش، خود مختار و خود مکتفی اور ماضی سے قطعی مختلف شعورِ خویش کا حامل تھا۔ حقیقت، معنیٰ اور لفظ کے باہمی تعلق، شعور و وجود کی باہمی نسبتوں اور ان کی مابعد الطبیعیاتی ہم آہنگی کا انکاری تھا۔ آفاق کا حس کی شرط اور اساس پر اور انفس کا جبلت کی بنا پر ادراک کرتا تھا۔ تسخیر فطرت اور جنت ارضی کا خواہش مند تھا۔ خوگرِ پیکرِ محسوس اور طاقت کا پجاری تھا۔ اس جدید انسان اور اس کے نظریات و تصوّرات کی یورپ سے برآمد بذریعہ استعمار (colonialism) ہوئی۔ یورپی استعمار تاریخ انسانی کا ایک عظیم اور غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس نے مُستعمَرین

(colonized) کی اجتماعی، معاشرتی اور نفسیاتی تنظیم نو کو ممکن بنایا۔ اس طرح سے استعماری جدیدیت وجود میں آئی جو معیاری یورپی جدیدیت سے بعض جزوی اعتبارات سے مختلف تھی۔ اس کی وجہ مُستعمَرین کی اپنی زمانی، مکانی اور تاریخی صورتحال تھی۔ جہاں پہلے جدیدیت کا غلغلہ بلند ہوا وہاں کی تاریخ سے تو اس کے ظہور کی وجوہات دریافت کی جا سکتی ہیں، چاہے ان وجوہات اور ان نتائج میں تعلق علت و معلول کا ہو یا ردعمل کا۔ لیکن مستعمرین کے ہاں یہ مکمل طور پر باہر سے آئی ہوئی اور قطعی اجنبی چیز تھی۔ اس فرق سے بہت سے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں (یورپی یا معیاری اور استعماری جدیدیت کا فرق ہمارے ہاں کے دیسی لبرلز کے رویے سے بھی ظاہر ہوتا ہے)۔

یہ عہد حاضر کی تشکیلی ساخت کے کچھ تاریخی عناصر کا بیان تھا۔ جہاں تک ان عناصر کا تعلق ہے جن کو معرض شہود میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور جن پر توجہ ہمارے خیال میں کم دی جا رہی ہے اس حوالے سے عرض ہے کہ انفارمیشن و ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز اور سائبر سپیس کی آمد اپنے اثرات میں بہت وسیع اور نفوذ و تاثیر میں بہت گہرا واقعہ ہے۔ یہ جدیدیت کا سب سے جدید مظہر ہے۔ جدیدیت اور استعمار کے بہت سے آدرشوں کا بالفعل حصول اس کے بغیر قطعی ناممکن تھا۔ جدیدیت کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک نئے زمان و مکان کو تشکیل دیا ہے۔ یہ بات اگر پوری طرح کہیں صادق آتی ہے تو جدیدیت کے اس مظہر پر آتی ہے۔ طاقت کے مابعد ڈسپلنری تصوّرات (smart power) اور سسٹم کی حاضر شکل اسی کی مرہونِ منّت ہے۔ جدیدیت نے جس طاقت و معیشت کے نظام کو جنم دیا تھا اس کو سائبر سپیس کی صورت میں جیسے گھر میسّر آ گیا ہے۔ طاقت و معیشت کی کچھ ایسی باہمی نسبتوں کا ظہور اس کے ذریعہ ہوا ہے جس کا اس کے بغیر کوئی امکان نہ تھا۔ علم اور تعلق کا مطلب اور دروبست تبدیل ہو گیا ہے۔ جدید معاشروں میں دینی اور روایتی زندگی کے اگر کوئی امکانات تھے تو وہ بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ انسانی علوم، تعلقات، تہذیبی و ثقافتی مظاہر میں اعلیٰ و ادنیٰ، بلندی و پستی، معیاری و غیر معیاری، اخلاقی اور غیر اخلاقی کی تقسیم کو محفوظ رکھنے والے خطوط و معیارات اب دھندلاتے جا رہے ہیں۔ اس کو Zygmunt Bauman کی اصطلاح میں سیال جدیدیت ((liquid/light modernity اور Ulrich Beck کی اصطلاح میں second modernity یا reflexive modernity بھی کہا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو مابعد جدید صورتحال قرار دیتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ جدیدیت ہی کا تسلسل اور

اس کے منطقی اور انتہائی نتائج ہیں۔ اصطلاح کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، بات بس یہ ہے کہ یہ ایسی مسلسل تغیّر پذیر صورتحال ہے جس سے ہم سب دوچار ہیں اور ایک جال ہے جس کا ہم سب شکار ہیں۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ کیا حاضر و موجود صورتحال کی معرفت اور جدیدیت کے کچھ نسبتاً تازہ مظاہر کو بنائے تفہیم و تجزیہ قرار دیے بغیر حالات کی درست تفہیم اور صائب نظاماتی تجزیہ (systemic analysis) ممکن ہے؟ المیہ یہ ہے کہ جدیدیت کی ایک نسبتاً پرانی تفہیم پر کلی نظاماتی تحلیل و تجزیہ کی بنا استوار کی جاتی ہے اور اسی سے اس سے نمٹنے، انقلاب و تبدیلی کے معانی اور حکمت عملی کا تعین کیا جاتا ہے۔ ویسے تبدیلی، انقلاب یا ریوولیوشن ایسے الفاظ ہیں جن کو مختلف سیاق و سباق میں مختلف معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ نظام کی سطح پر تبدیلی کو انقلاب قرار دینا ایک خاص تاریخی صورتحال کا نتیجہ ہے اور تاریخی مؤثرات کی کارفرمائی اس میں واضح دکھائی دیتی ہے۔ یہ بات انقلاب کے اس تصوّر کے صحیح یا غلط ہونے کا بیان نہیں ہے بلکہ حقیقتِ واقعہ کا بیان ہے۔ بات یہ ہے کہ بجائے انقلاب اور تبدیلی کے ان تصوّرات' جو اپنا ایک خاص تاریخی سیاق و سباق رکھتے ہیں' کا استناد مذہبی متون میں تلاش کیا جائے' ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں اپنے عہد میں ہونے والے تغیرات سے متعلق رکھا جائے۔

وہ تحریکیں جو نظام کی سطح پر تبدیلی کی خواہش مند ہیں' ان کو دو سوالات کا سامنا ہے اور ان سوالات کے جوابات میں جائز اختلافات کو برداشت کرتے ہوئے ان کو درست تناظر میں دیکھنا اصل امتحان ہے۔ جوابات میں اختلاف کا ہونا اور تناظر کا درست نہ ہونا دو الگ الگ مسائل ہیں۔ جوابات میں اختلاف فطری اور مفید ہے۔ اور تناظر کا درست نہ ہونا ذہنی اور عملی طور پر اپنے عصر سے غیر متعلق ہو جانے کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ دو سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نظام/سسٹم کیا ہے؟ ۲۔ تبدیلی یا انقلاب کا طریقہ کار کیا ہے؟

انہی سوالات سے کچھ ضمنی سوالات بھی جنم لیتے ہیں' مثلاً کیا تبدیلی/ انقلاب ممکن ہے؟ اصل مسئلہ بقا کا ہے یا انقلاب کا؟ کیا انقلاب کے بغیر بقا ممکن ہے؟ سسٹم کو بدلنے کے لیے سسٹم میں شمولیت کیا انسان کو اندر باہر سے بدل نہیں دیتی؟ کیا سسٹم کا غلبہ اس حد تک مکمل ہے کہ اقدار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا؟ یہ سوالات دعوتِ غور و فکر کے لیے اٹھائے گئے ہیں۔ سوالات کو دیانت داری سے اٹھایا جائے اور ان کا سامنا کیا جائے' پہلے تو یہ ضروری ہے۔ جوابات تو بعد کی بات ہے۔

جس درست تناظر کی ہم بات کر رہے تھے وہ بنیادی طور پر ان دو اساسی سوالات سے

متعلق ہے اور باقی سوالات بھی ظاہر ہے کہ اس کے ضمن میں ہی آتے ہیں۔ درست تناظر سے مراد یہ ہے کہ ان سوالات کا سامنا اور ان کے جواب کی کاوش انسان اپنی نظری[۱] اور مشاہداتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کرے گا۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ اپنے کل میں کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے سوال کی حد تک تو یہ بات کافی حد تک متفق علیہ ہے، لیکن دوسرے سوال کا سامنا کرتے ہوئے جب منہج کا مسئلہ اٹھتا ہے تو اس کو اس لیے شرعی کے بجائے ''نظری'' یا ''مشاہداتی'' قرار دینا مفید ہے کہ منہج کے اخذ و توضیح میں اپنے اپنے زمانے اور عہد سے ہی استفادہ کیا جاتا ہے اور اپنے اپنے عہد کے نظریات و تصورات کی روشنی میں ہی الوہی متن کی تعبیر کی جا رہی ہوتی ہے۔

کیا شریعت و سُنّت کوئی نظاماتی تبدیلی کا منہج فراہم کرتی ہے؟ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہے وہ دین کی جدید اصولوں پر تعبیر کرتے ہیں۔ شریعت کسی منہج کے اجزاء پر قانونی یا بہتر ہے کہ کہا جائے فقہی سوال اٹھائے گی اور اس کل پر اخلاقی، کیونکہ کل فقہ اور قانون کا موضوع نہیں ہے۔ کل پر اخلاقی اور اقداری سوال پیدا ہو گا اور اس کی خاص ضرورت مغربیت اور جدیدیت کے ہمہ گیر استیلاء کے بعد پیدا ہوئی۔ یہیں سے نظاماتی تجزیہ اور اس سے متعلقہ مباحث کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ اس بات کی توضیح میں کچھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر شریعت یا صاحب شریعت کی

---

[۱] نظر و فکر کی ایک عام تعریف ''ترتیب امور معلومة لیتادی الي امر مجهول'' کی جاتی ہے یعنی معلومات سے مجہولات کی طرف حرکت ذہنی کو نظر و فکر کہا جاتا ہے۔ معلوم منقول بھی ہو سکتا ہے اور مشاہَد بھی، لیکن معلوم سے مجہول کی طرف ذہنی حرکت نہ منقولی ہو گی نہ مشاہداتی بلکہ عقل کی صلاحیت تعقل کا نتیجہ ہو گی۔ یہاں نظری سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسئلہ کی تفہیم کے لیے مشاہدہ کے ساتھ ساتھ استدلال و استنباط کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر صرف مشاہدات و منقولات ہی کافی نہیں ہیں، بلکہ معقولات و فکریات سے تعرض بھی لازمی ہے۔ اس میں استقراء اور استخراج دونوں طرح کے منطقی مناہج اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی تہذیب یا نظام اپنے تصوّرِ خویش کو self statement کی صورت میں بیان کرتا ہے جس کو اس کے مستند نمائندوں اور شارحین سے اخذ کیا جا سکتا ہے تو ان کلیات کو اس تہذیب کے پروردہ علوم اور اداروں پر منطبق کر کے ان کا تحلیل و تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ استخراجی طریقہ کار ہے۔ اسی طرح استقرائی طریقہ پر ان اداروں اور علوم میں مشاہدہ اور تجزیہ کے ذریعے مابہ الاشتراک کو دریافت کیا جائے اور اس سے کلی اصول اخذ کیے جائیں۔ اس طریقہ کار کے نتائج اور نظام یا تہذیب کے اپنے بیان کردہ بیان میں کوئی خاص فرق عام طور پر نظر نہیں آتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان کو اپنے دینی اور تہذیبی تناظر میں ہی دیکھتے ہیں جس کے نتیجے میں مابعد الطبیعیاتی اور اقداری تناظر میں تبدیلی کے باعث حکم میں ایک بنیادی فرق واقع ہو جاتا ہے۔

سُنّت و سیرت، نظاماتی تبدیلی کا کوئی باقاعدہ منہج فراہم کرتی ہے تو اس بات کی بنیاد دو مفروضات پر ہے:

۱۔ نظام کی سطح پر تبدیلی شریعت کے اساسی مقاصد میں سے ہے یعنی مقصود بالذات ہے۔

۲۔ نظام گویا متحجر (fossilized) شے ہے۔تغیر ہوتا بھی ہے تو صرف جزوی۔

ان دونوں مفروضات پر بہت سے اشکالات پیش کیے جاتے ہیں اور ان کے جو بھی جوابات دیے جاتے ہیں وہ علمی طور پر اپنی ایسی مضبوط بنیادیں نہیں رکھتے کہ پھر کلام کی گنجائش ہی نہ رہے۔ الوہی متن اور اس کی تشریح و توضیح کو ہماری تاریخ میں جس طرح سے پڑھا پڑھایا، سمجھا سمجھایا گیا ہے اس سے بھی پہلا مفروضہ کچھ لاتعلقی کو ظاہر کرتا ہے۔ منہج کو اگر اخذ کیا جائے گا تو اپنے زمانے ہی سے کیا جائے گا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے جو لوگ منہج کو اپنے تئیں الوہی متن یا حامل متن کی سُنّت و سیرت سے اخذ کرتے ہیں وہ بھی تعبیرِ تاریخ میں بالفعل اپنے عہد ہی سے استفادہ کر رہے ہوتے ہیں اور اپنے عہد ہی کے نظریات و تصوّرات کی روشنی میں الوہی متن کی تعبیر شعوری یا لاشعوری طور پر کرتے ہیں۔ منہج جو بھی ہوگا وہ انسانی عمل سے متعلق ہوگا۔ اب عمل مثبت یا عمل منفی یعنی کچھ کرنے اور کچھ نہ کرنے پر شریعت سے حکم پوچھا جائے گا اور شریعت ان تمام اعمال پر بلاواسطہ کوئی نہ کوئی حکم ضرور لگائے گی۔ ان تمام اعمال سے جو کل بنے گا جسے ہم منہج کہہ رہے ہیں وہ قانون سے زیادہ اخلاق اور اقدار کا موضوع ہے اور اسے مقاصد شریعت یا مصالح اور مفاسد کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ فقہ و قانون سے اس کا تعلق بنے گا تو بالواسطہ بنے گا۔ دین جس طرح منبع قانون و فقہ ہے اسی طرح منبع اخلاق و اقدار بھی ہے۔ یہاں ہم جدید معنوں میں قانون و اخلاق کی دوئی کی بات ہرگز نہیں کر رہے۔ اسے اگر اپنی روایت میں رہتے ہوئے سمجھنا ہو تو ہماری فقہ میں قضاءً و دیانتاً کی تقسیم سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک بات قانون کے دائرے میں نہیں آ رہی لیکن نیت یا کسی اور وجہ سے وہی بات آخرت میں پکڑ کا باعث بن سکتی ہے۔ ہمارے ہاں جدید طرز پر قانون و اخلاق دو الگ الگ دائرے نہیں ہیں بلکہ اخلاق ایک بڑا دائرہ اور فقہ و قانون اسی دائرے کے اندر ایک دائرہ بناتے ہیں۔ اس مسئلہ کو تہذیبی تناظر اور فقہی نظر کے فرق کے عنوان سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ فقہ جزئیات سے بحث کرتی ہے، سیاسی اور تہذیبی صورتحال سے تعرض نہیں کرتی۔ عملاً ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب مصالح، مفاسد اور مقاصد شریعہ کی روشنی میں کسی صورتحال یا نظام طاقت و معیشت

اوراس کے اداروں کوسمجھ لیا جائے تو اب اس تناظر میں رہتے ہوئے فقہی حکم لگایا جائے گا، لیکن فقہ کا یہ تعرض بالواسطہ ہوگا۔ بس ان ذرائع اور وسائط کی اہمیت کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔ اسی سے ملتے جلتے طریقہ کار کو حضرات متجددین بھی استعمال کرتے ہیں مگر ان کا مقصد دائرہ شریعت کوسکیڑنا ہوتا ہے، جبکہ یہاں جو بات کی جارہی ہے وہ شریعت کو زندگی کے ہر انفرادی اور اجتماعی مظہر سے جوڑے رکھنے سے متعلق ہے۔

جہاں تک پہلے سوال میں تناظر کی درستی کا معاملہ ہے تو بات یہ ہے کہ سسٹم چونکہ مستقل تغیر پذیر ہے اور اپنی شکلیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔[1] اس لیے تفہیمی تناظر میں تبدیلی بھی ناگزیر ہے۔ Accomodation (سسٹم اپنے غیر کو اپنے اندر جذب کرنے کا کامل بندوبست رکھتا ہے اور تبدیلی اور انقلاب کے نعروں اور باغیانہ خیالات کے اظہار میں بھی اپنے لیے کچھ نہ کچھ مفید مطلب ڈھونڈ نکالتا ہے۔) اور Adaptation (غیر کو جذب نہ کرنے کی صورت میں اپنے اندر ہی کچھ ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا تاکہ other کے لیے گنجائش پیدا ہو سکے سسٹم کے لیے کچھ مشکل نہیں، حرکت اور تغیر ہی تو اس کی بنیادی قدر ہے۔) کی یہ صلاحیت جس کو سسٹم دوامی طور پر بروئے کار لاتا رہتا ہے، ہی سسٹم کے استحکام کی وجہ ہے۔ ایسا سسٹم جو مستقل اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی شکل بدلتا رہتا ہے اس سسٹم کی تفہیم کے لیے ایک ایسا تناظر جو دہائیوں پہلے ایک خاص صورتحال میں وضع کیا گیا ہو، کافی ہوسکتا ہے؟ کیا ایسے سسٹم کی تفہیم کے لیے مسلسل مشاہدہ اور غور وفکر یا نظری سرگرمی کی احتیاج نہیں ہے؟ یہ پہلے سوال کے حوالے سے تناظر کی درستی ہے۔ اب سسٹم یا نظام کیا ہے؟ اس کے مختلف جوابات دیے جاسکتے ہیں اور اختلاف فطری بھی ہوگا اور مفید بھی، مگر دہائیوں پرانے تصوّر پر اصرار سسٹم کی کلی عدم تفہیم پر دلالت کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سسٹم کی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں، انسانی نفس پر ہونے والی تاثیرات اور طاقت اور معیشت کے تصوّرات میں ہونے والی تبدیلیوں کا ادراک کیا جائے اور ایسا زندہ تناظر دریافت کیا جائے جو حاضر وموجود اسلوبِ حیات سے متعلق ہو۔ دوسرے لفظوں میں یا حق وباطل کے تناظر میں کہا جائے تو باطل کی نئی صورتوں اور ہیئتوں کو زیر بحث لایا جائے۔

---

[1] ٹیکنالوجیائی ترقی کا اس میں اہم کردار ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ مارکس فیوڈلزم سے کیپیٹلزم کی طرف ہونے والی تبدیلی کی ایک بڑی وجہ ذرائع پیداوار میں سے hand mill کا steam mill کی صورت میں تبدیل ہوجانا قرار دیتا ہے۔

وہ تحریکیں جو تبدیلی کے لیے کسی خاص منہج یا ''تزویراتی حکمتِ عملی'' کو اختیار کرنا اور اپنے زمانے کی معرفت کو اہم قرار دیتی ہیں ان کے لیے مندرجہ بالا ترجمہ کیے گئے مضمون اور اس طرح کے مباحث سے ممکن ہے اتفاق یا اختلاف دونوں صورتوں میں استفادہ کا کوئی سامان ہو جائے۔ پھر وہ لوگ جو منہج یا حکمت عملی کو شرعی مآخذ سے اخذ کرنا مفید سمجھتے ہیں وہ بھی short cuts کے بہر حال قائل رہے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کو استعمال میں لاتے رہے ہیں' ان کے لیے بھی اس طرح کے مباحث سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔ باقی رہی بات ان لوگوں کی جو یہ سمجھتے ہیں کہ اصل اہمیت ''تدبیر'' یا ''عصری تفہیم'' کی نہیں بلکہ ایمان' عمل صالح نیت اور اخلاص ہی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور اصل جائے محنت یہیں ہے۔ تو یہ موقف بھی ایک خاص معنوں میں اپنی مضبوط اساس رکھتا ہے اور ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی'' کو بعض لوگ اسی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن شاید ''نظاماتی تجزیہ'' اور اس سے متعلقہ مباحث اس موقف کے حاملین کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرا پائیں[۱]۔ اس طرح کے مباحث اور ان کے حاصلات سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی راہ عمل ومزاحمت سامنے آئے '، مگر دوسرا حاصل جو بعض اعتبارات سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ خوامخواہ کی مشقت' لایعنی عمل اور بلا وجہ کی امیدوں سے نجات حاصل کی جائے اور چھوٹے پیمانے پر کیے جا سکنے والے کاموں پر توجہ دی جائے جن کے اصلاً بحیثیت مسلمان ہم مکلّف بھی ہیں۔

ایک اعتراض یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ گفتگو تو ایک مغربی تناظر میں کی گئی ہے اور اس طرح کے اکثر مباحث میں مغربی مفکرین کے نام ہی نظر آتے ہیں تو اس کا ہماری لوکل صورتحال سے کیا تعلق ہے؟ تو بظاہر نظریہ آتا ہے کہ جدیدیت ومغربیت کا نفوذ نظاماتی، معاشرتی اور نفسیاتی سطحوں پر ہمہ گیر ہے اور اس ہمہ گیریت اور عالمگیریت میں ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی آمد

---

[۱] یہاں اس موقف کی تردید نہیں کی جا رہی بس یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ موقف اس موضوع بحث سے خارج ہے اور اس موقف کے حاملین کے لیے اولین دلچسپی کا موضوع یہ مباحث نہیں ہو سکتے ثانوی توجہات کا مرکز کچھ اسباب کی بنا پر ہو سکتے ہیں۔ یہ موقف بجائے خود اس لائق ہے کہ اس پر الگ سے کلام کیا جائے کہ کچھ نصوص سے اپنا استناد واضح طور پر رکھتا ہے۔ اس موقف کے حاملین کے نزدیک جدید دنیا اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ''تحدیات'' سے زیادہ ''فتن'' کی حیثیت رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان دونوں کا انسانی ردعمل باہم بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہ ایک قیمتی بات ہے اور اگر اسے عقلی اور نقلی دلائل سے مؤید کیا جائے تو یہ باقی مواقف سے اپنی علمی حیثیت میں، بظاہر غیر علمی لگنے کے باوجود، شاید زیادہ مضبوط موقف ثابت ہو۔ یہاں ہم نے گفتگو ایک خاص موضوع پر، مخصوص سیاق وسباق میں مخاطب کے دائرۂ فکر وعمل میں داخل ہوتے ہوئے کی ہے۔

سے از حد اضافہ ہو چکا ہے۔ ہماری صورتحال بہت سے جزوی فروق کی حامل ہے لیکن ہے عالمی صورتحال کا حصہ ہی۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ عقل و ذہانت کے دو وظائف ہیں۔ واقعات و تصوّرات میں ایک امتیاز قائم کرنا اور ان کی وحدتِ اصلی اور کلیت کو دریافت کرنا۔ اگر ان میں سے ایک وظیفہ بھی خام رہ جائے تو تصویر ادھوری اور تصوّر ناقص رہ جاتا ہے۔ کُل پر اپنی تمام توجّہ صرف کر دینے والے بہت سے ضروری امتیازات کو نظر انداز کر ڈالتے ہیں اور جزء جزء میں سر کھپانے والے اشیاء اور تصوّرات کی کلی تصویر اور مکمل تصوّر تک نہیں پہنچ پاتے۔

حواشی وتوضیحات

(1) Byung Chul Han کوریں نژاد جرمن فلسفی، مفکر اور social theorist ہے۔ اس کے خیال میں digitalization, neo-liberalism , late/hyper capitalism کے بعد جس دنیوی اور انسانی صورتحال نے جنم لیا ہے اس کو فلسفیانہ تفکر کا موضوع بننا چاہیے، جبکہ اکیڈمک فلسفے میں پرانے اور گھسے پٹے موضوعات ہی چلے آ رہے ہیں اور فلسفہ حاضر و موجود اسلوبِ حیات سے غیر متعلق ہو چکا ہے۔ گویا اس کا موضوع جدید انسان اور جدید سسٹم اور اس میں کارفرما طاقت کے تصوّرات کی مظہریاتی تفہیم ہے Digitally and technologically driven late capitalism کے دور میں جن کو وہ بالترتیب neo-liberal subject اور neo-liberal system قرار دیتا ہے، اس کے طریقۂ تفہیم پر ہائیڈیگر کے کچھ اثرات ہیں۔ اس کے خیال میں ہائیڈیگر کے "Being in the world" میں "Being" اور "world" دونوں digitalization اور نیو لبرلزم کے اثرات کے باعث تبدیلی کا شکار ہیں۔ ("Dasein") یا "Being in the world" ہائیڈیگر کے ہاں انسان کے ہی دو عنوانات ہیں۔

اس نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ہمیں ہائیڈیگر کی Being and Time کے digital reboot کی ضرورت ہے۔ اس نظاماتی اور انسانی صورتحال سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کو وہ درج ذیل عنوانات سے معنون کرتا ہے:

Burnout Society
Information Society
Transparency Society
Porn Society
Culture of Visibility
Digital control society

جدید مغربی فلسفے میں انسان کو Human Subject کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ دنیا، اشیاء، تعلقات اور لوگوں سے مجرد، ماوراء اور منفک ایک آزاد وجود۔ انسان کا یہ ''تجریدی تصوّر'' ہائیڈیگر کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ Dasein یا Being in the world کی اصطلاح انسان کے لیے استعمال کرنے کا مقصد یہی تھا کہ انسان کو ان تعلقات سے جو وہ دنیا، اشیاء اور لوگوں کے ساتھ رکھتا ہے، الگ کرکے دیکھنا ایک فلسفیانہ مغالطہ ہے اور اس کے نتیجے میں آپ کا مُدرَک حقیقی انسان نہیں ہوگا بلکہ ایک تصوّراتی انسان ہوگا۔ بیان چل ہان یہاں سے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ اب جدید انسان کو مجرد subject نہیں کہا جا رہا بلکہ اس کو ایک project بنا دیا گیا ہے جس کو وہ achievement subject کہتا ہے۔ وہ منفیت (negativity) جو object اور subject میں ایک فاصلاتی نسبت قائم رکھتی تھی اور انسان کے تجریدی تصوّر کی بھی ایک وجہ بنی تھی اب مکمل positivity میں تبدیل ہو چلی ہے جو ان تعلقات کو تسلیم کرتی ہے جو انسان اور دنیا کے بیچ پائے جاتے ہیں اور اس تجریدی تصوّر کو بھی قابلِ اعتناء نہیں گردانتی، مگر وہ ان تعلقات کو صرف انسان کی تفہیم کے لیے ہی استعمال نہیں کرتی بلکہ انسان کی تعمیر/تخریب، استحصال/آزادی کے لیے استعمال کرتی ہے۔ یہی جدید neoliberal سسٹم کا کمال ہے کہ اس نے آزادی اور استحصال، تعمیر اور تخریب کے فرق کو ختم کر دیا ہے۔ پھر ہائیڈیگر کی world حقیقی دنیا تھی اب انسان digital habitat میں رہتا ہے جہاں ہونے کا انداز اور قوانین مختلف ہیں۔

الیکٹریکل میڈیا جب سامنے آ رہا تھا تو مارشل میکلوہن نے 1964 میں کہا تھا کہ:

" The electric technology is within the gates, and we are numb, deaf, blind and mute about its encounter with the gutenberg technology."

ہان کے خیال میں ڈیجیٹل میڈیا کے حوالے سے ہمیں ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے:

" This new medium is reprogramming us, yet we fail to grasp the radical paradigm shift that is underway..... is definitely changing the ways that we act, perceive, feel, think and live together." (In the Swarm, Digital Prospects)

ہان جدید ڈیجیٹل ماحول میں زیست کرنے والے فرد کو Homo Digitalis قرار دیتا ہے۔ ہر سسٹم اپنے devotional objects پیدا کرتا ہے۔ ڈیجیٹل عہد کا یہ معروض ''سمارٹ فون'' ہے اور یہ rosary کا متبادل ہے جو کہ عیسائیوں کے ہاں تسبیح کی طرح کی ایک چیز ہے۔

(2) Antonio Negri پوسٹ مارکسسٹ سیاسی اور سماجی فلسفی ہے جو سرمایہ داری کے خلاف عالمی مزاحمت پر یقین رکھتا ہے۔ Empire(2000),Multitude(2004), Commonwealth(2009) اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس کے تصوّر multitude کا تذکرہ ہان نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے اور اس کا رد بھی کیا ہے۔

(3) "Multitude" سے مراد وہ گلوبل باغی طبقہ ہے جو سسٹم کے خلاف مزاحمت پر یقین رکھتا ہے۔ Cyberspace نے اس طبقے کی باہمی communication کو ممکن بنا دیا ہے۔ گویا ان کا خیال ہے کہ اگر digital world نے نظام کو عالمی بنایا ہے تو یہی اس کے خلاف عالمی مزاحمت کو ممکن اور مزاحمت کاروں کو آپس میں جوڑنے کا باعث بنے گا۔ ہان کو اس کی اس بات سے اختلاف ہے۔

(4) نیولبرلزم کے حوالے سے ایک بیان تو یہ ہے کہ یہ ایک economic theory ہے جو market drivenness,privatization اور policy and subserviency of the state to the market کا بیان ہے، لیکن ہان اس کو سرمایہ دارانہ نظام کی جدید شکل اور ایک سسٹم کی حیثیت سے دیکھتا ہے کہ ریاست اور مارکیٹ کے اس خاص اشتراک نے ایک غیر مشخص نظام کو جنم دیا ہے جس کا ایک مخصوص تصوّرِ طاقت ہے جس نے استحصال بذریعہ آزادی کے ایک ایسے طریقے کو جنم دیا ہے جو اپنی کارکردگی میں غیر معمولی

ہے اور اس میں digital media کا بنیادی کردار ہے بلکہ اس کے بغیر سسٹم شاید معرضِ شہود میں آ ہی نہ پاتا۔ یہ hegemony of the system ہے کسی فرد یا طبقے کی حکومت نہیں ہے۔

Neo-liberalism represents a highly efficient, indeed an intelligent system for exploiting freedom. Everything that belongs to practices and expressive forms of liberty - emotion, play and communication comes to be exploited. It is inefficient to exploit people against their will. Allo exploitation (exploitation by other) yields scant returns. Only when freedom is exploited are returns maximized. (Psychopolitics,the crisis of feedom)

(5) یعنی انسانی نفس بھی ایک commodity میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایرک فرام نے اس کے لیے personality market کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس مارکیٹ میں انسان اپنے آپ کو خود بیچنے کے لیے پیش کرتا ہے' گویا اپنا استحصال خود کرتا ہے۔ ہان اس کے لیے auto exploitation کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب Psycho Politics میں لکھتا ہے:

" As a mutant form of capitalism ,neo liberalism transforms workers into entrepreneurs."

مزید لکھتا ہے:

As the entrepreneur of its own self, the neo liberal subject has no capacity for relationship with others that might be free of purpose.

(6) اگر ناکامی کا ذمہ دار انسان سسٹم یا نظام کو سمجھنے کی بجائے اپنے آپ کو سمجھنے لگے تو بغاوت کے جراثیم جنم لینے کے بجائے ڈپریشن کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ موٹیویشنل سپیکرز اس حوالے سے سسٹم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ "Yes you can" کا نعرہ بہت سے حقائق اور factors پر پردہ ڈال دیتا ہے اور نتیجہ کے طور پر انسان کے پاس ناکامی کی صورت میں اپنے آپ کو الزام دینے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ حقیقت میں سسٹم کے بیان

کردہ idealsاور'کامیابی' کا تصوّر انسانوں کی ایک بڑی اقلیت کے لیے بھی قابلِ حصول نہیں ہوتا چہ جائیکہ تمام انسان اس کو حاصل کر پائیں۔ جو اس دجل کو شعوری یا لاشعوری طور پر جان لے اور کامیابی کے حصول کے لیے پیداواری عمل میں اپنی کل صلاحیتیں صرف نہ کرے اس کو سسٹم نفسیاتی مریض قرار دیتا ہے۔ یہاں سے علمِ نفسیات اور psychologists کا کام شروع ہوتا ہے کہ وہ ایسے آدمی کو دوبارہ اس 'قابل' بنا دے کہ وہ سسٹم کے لیے اپنا تن من دھن لگا دے اور اس کو مفید اور عقلی طرزِ عمل گردانے۔ گویا اگر غور کیا جائے تو ایک خاص معنوں میں موٹیویشنل سپیکرز اور نفسیات دان مختلف جہات سے سسٹم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

(7)Anti-globalization movement میںNaomi Kleinایک مشہور نام ہے۔No Logo Movement(2000)اس کی پہلی کتاب ہے جو"Brand" culture کا بیان ہے کہ کس طرح کمپنیوں نے پراڈکٹ سے زیادہ اپنے برانڈ امیج پر توجہ دی ہے۔The Shock Doctrine(2007)) نیولبرلزم پر ایک بنیادی تنقید ہے۔اسی کتاب کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔

(8) برن آؤٹ سنڈروم کی ایک تو سادہ تعریف ہے جو نفسیات کی کتابوں میں ملتی ہے کہ جب کوئی کام بہت زیادہ اور لمبی مدت تک کیا جائے تو ایک نفسیاتی اور جسمانی تھکن انسان پر طاری ہوتی ہے۔ یہ وہ تھکن نہیں ہے جو صبح سے شام تک کام کرنے سے انسان پر طاری ہوتی ہے اور آرام کرنے سے انسان اگلے دن پھر ''کام'' کے لیے تیار ہو جاتا ہے بلکہ یہ ایک بیماری ہے جو لمبی مدت تک رہتی ہے۔ہان نے جدید معاشرہ کو جہاں مختلف عنوانات سے معنون کیا ہے ان میں ایک burnout society بھی ہے۔اس نام سے اس کی ایک کتاب بھی ہے جو 2015ء میں چھپی۔ ہان کے خیال میں اکیسویں صدی نیوریاتی بیماریوں (neurological illness) کا زمانہ ہے جس میں depression,ADHD, BPD, اور burnout syndrome شامل ہیں جبکہ اس سے قبل بیکٹیریا اور وائرس سے پھیلنے والی بیماریوں کا زمانہ تھا۔ یہ بات طبی تناظر میں نہیں کی جا رہی بلکہ جدید سسٹم اور اس میں انسانی صورتحال کے تناظر میں کی جا رہی ہے۔ یقیناً وائرس اور بیکٹیریا اب بھی شدّت سے پائے جاتے ہیں لیکن ان میں

''دیگریت''(otherness)تھی اور immunology کے ذریعے ان سے بچنا ممکن تھا۔اس کو ہان"negativity" کہتا ہے جبکہ اب زمانہ "excess" اور "positivity" اور "sameness" کا ہے۔ نیوریاتی بیماریاں ''کثرت'' اور "positivity" کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ ہان کا اپنا ایک discourse ہے جس کا ترجمہ یا ترجمانی اردو زبان میں اتنی آسان نہیں ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نفسیاتی بیماریاں اور خاص طور پر برن آؤٹ excess کی وجہ ہی سے جنم لیتی ہیں۔ جدید انسان achievement subject ہے۔ اسے مستقل کچھ کرنا ہے، آگے بڑھنا ہے، کچھ پانا ہے اور بن کے دکھانا ہے۔ اس سب کا پریشر اصل میں تو خارج سے آ رہا ہے لیکن یہی neoliberal system کا کمال ہے کہ وہ اس کو انسان کا داخلی تقاضا بنا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے انسان کچھ ''بننے'' اور ''پانے'' کے لیے بہت محنت اور کام کرتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کے ''ہونے'' کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ آزادی اور جبر میں ہمیشہ ایک نسبتِ تضاد سمجھی گئی ہے لیکن یہ سرمایہ داری کی اس حالیہ شکل کا کارنامہ ہے کہ اس نے ان دو کو ایک کر دیا ہے۔ گویا ''امکانات'' کے ساتھ ساتھ ''محالات'' کی دنیا پر بھی ہاتھ صاف کر دیا ہے۔ نظاماتی جبر اور انسانی آزادی کا مسئلہ لبرل مفکرین کے لیے عنوانات اور جہات کے اختلاف کے ساتھ ہمیشہ ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ نیولبرل سسٹم نے جیسے اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے اور اب انسانی نفس کے اقتضاءات اور سسٹم کی مرادات گویا ایک ہو گئی ہیں یہی سسٹم کے کارگر ہونے اور استحکام کی بنیاد ہے۔ آزادی کا استحصال ایسا لطیف جبر ہے جس کا ادراک ایک عام ذہن کو نہیں ہو پاتا۔ فرائیڈ کی اصطلاح میں کہا جائے تو id اور super ego جن میں ہمیشہ مخاصمت کا تعلق رہتا ہے ان کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ Achievement subject اپنا استحصال خود کرتا ہے۔ ہان لکھتا ہے:

"The achievement subject exploits itself until it burns out."

حقیقی خودی اور آدرشی خودی میں ہمیشہ ایک فاصلہ رہتا ہے۔ اس فاصلے کو پاٹ نہ سکنا خود پر تشدد اور ظلم کو جنم دیتا ہے یہاں تک کہ انسان برن آؤٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یعنی برن آؤٹ انسان کی خود تشددی، خود استحصالی اور کام اور محنت کی زیادتی سے جنم لیتا ہے۔("Excess

of positivity" سے ہان اسی تصوّر کو بیان کرتا ہے) نہ کہ کسی دوسرے کے جبر اور استحصال سے جس میں ایک دیگریت (otherness) پائی جاتی ہے (ہان اس کو negativity کے لفظ سے بیان کرتا ہے)۔ گویا جدید achievement society میں نیولبرل انسان کے نفسیاتی مسائل کی وجہ اثباتیت کی زیادتی (excess of positivity) ہے نہ کہ منفیت (negativity)۔

(9) Alienation ۔ مارکس کے خیال میں work انسان کی ذات کا اظہار ہونا چاہیے۔ یعنی انسان اور اس کے کام میں ایک تعلق ہونا چاہیے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے کام کو انسان سے کاٹ دیا ہے' اس کو وہ بیگانگی (Alienation) قرار دیتا ہے۔ Alienation کے اس تصوّر کو کچھ Neo-Marxists نے وسعت دی اور اس کو انسان کی انسان سے' انسان کی فطرت سے اور انسان کی اپنے کام سے بیگانگی قرار دیا اور اس سب کا ذمہ دار سرمایہ دارانہ نظام کو ٹھہرایا مثلاً Erich Fromm۔ اب لوگ کسی پراڈکٹ کے مختلف اجزاء پر کام کرتے ہیں۔ جب وہ چیز مکمل ہو کر سامنے آتی ہے تو اس سے ان تمام کام کرنے والوں کا کوئی ذاتی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس پراڈکٹ کی قیمت اور اہلیت کا تعین اس کی exchange value سے ہوتا ہے جو کہ مارکیٹ سے متعلق ہوتی ہے نا کہ اس کی use value یا intrinsic value سے۔ Use value تو متعین ہوتی ہے جبکہ exchange value کو طے کرنے والے بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔ Brand image ان میں سے ایک ہے۔

(10) یہ کتاب 2014 میں چھپی تھی۔ مصنف کے خیال میں انٹرنیٹ کی آمد نے ایک نئی برابری کی معیشت (Egalitarian Economy) کو جنم دیا ہے۔ اس کی وجہ سے پیداوار اور تقسیم کی لاگت میں کمی آرہی ہے اور مزید آئے گی جس سے سرمایہ داری کو نقصان پہنچے گا اور اشتراک کی معیشت وجود میں آئے گی۔ Prosumers وجود میں آرہے ہیں جو بیک وقت Producers بھی ہیں اور consumer بھی۔ ہان کو اس بات سے اختلاف ہے۔ اس کے خیال میں یہ سرمایہ دارانہ نظام کی تقویت کا باعث بنے گا۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۴۶)

عالم اسلام/فلسطین ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

حماس اور غزہ

جہادِ فلسطین کامیابی کی منازل طے کر رہا ہے

7 اکتوبر 2023ء کو حماس کے مجاہدین نے اسرائیل پر حملہ کر کے جہاد فلسطین کو کامیابی کے نئے مرحلے میں داخل کر دیا۔ تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اسرائیلی دہشت گرد حماس کو غزہ سے بے دخل کرنے میں ہنوز نا کام ہیں۔ دسمبر 2023ء کو جناب اسامہ حمدان نے، جو لبنان میں حماس کے نمائندہ ہیں، اپنے بیان میں فرمایا "غزہ کا مستقبل حوصلہ افزا ہے کیوں کہ ہمیں فلسطینی عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔"

اسرائیلی دہشت گردی نے غزہ پر حملے کا مقصد حماس کو منتشر کرنا بتایا ہے۔ اس ہدف کا اعلان صہیونی وزیر اعظم نیتن یاہو نے بار بار کیا ہے اور اس نے اسے غزہ کی اسرائیلی دہشت گردی کا واحد مقصد قرار دیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے میں اسرائیلی دہشت گرد اس حد تک نا کام ہیں کہ ان کا قریب ترین بنیادی حلیف امریکہ بھی اب انہیں غزہ کی تباہی کی تزویراتی نا کامی کو قبول کر لینے کا مشورہ دے رہا ہے کیونکہ امریکی دہشت گرد افغانستان کی اپنی شکست سے یہ سبق سیکھ چکے ہیں کہ بمباری اور فوج کشی کے ذریعے ہلاکت عامہ کو فروغ دے کر عوام کو مجاہدینِ اسلام کی پشت پناہی سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ امریکہ نے تو آٹھ کروڑ ریڈ انڈین قتل کر دیے لیکن اسرائیل فلسطین کے چار کروڑ مسلمانوں کو قتل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

یہی سبق فرانسیسی دہشت گردوں نے اپنی ساحلی افریقی پسپائیوں سے حاصل کیا ہے۔ ستمبر 2023ء میں فرانسیسی صدر میکرون نے کہا تھا کہ حماس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ کیا اسرائیل کئی دہائیوں پر دراز جنگ لڑنے کی ہمت کر سکتا ہے؟ اسرائیل کے اپنے ایک فوجی مشیر نے حال ہی میں حماس کے خلاف مہم کو مبہم اور غیر موثر قرار دیا ہے۔

حماس 1987ء میں منظر عام پر آئی اور اس وقت سے لے کر آج تک تقریباً 11 مہمات اسرائیلی دہشت گردوں نے اس کو ختم کرنے کی چلائی ہیں جو سب کی سب نا کام رہی ہیں اور

حماس کی عوامی جڑیں مضبوط سے مضبوط ہوتی جارہی ہیں۔حماس کا تنظیمی ڈھانچہ اس قسم کی مہمات کو ناکام بنانے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ہر صہیونی انہدامی مہم کے بعد حماس کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور آج مقبوضہ مغربی ساحل اور غزہ میں گھر گھر پر حماس کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ بمباری اور دہشت گرد حملوں کے تسلسل کے باوجود حماس کو ختم کرنے کا تو کیا سوال تزویراتی محققین تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اسرائیلی دہشت گرد حماس کو مقبوضہ علاقہ میں گھس کر اسرائیلی فوج اور تنصیبات پر حملہ کرتے رہنے سے روکنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ حماس پورے فلسطین میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کا عزم رکھتی ہے اور مبصرین کی رائے میں وہ کسی قیمت پر بھی اس عزم کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں کی جاسکتی۔

موجودہ جنگ میں حماس کے نقصانات محدود ہیں اور اسرائیلی فوجی کامیابیوں کی خبریں مستقل جھوٹی ثابت ہورہی ہیں۔حماس کے 50 ہزار مجاہدین برسرپیکار ہیں اور ان کی صفوں میں تیز رفتاری سے اضافہ ہورہا ہے۔اسرائیل نے دعویٰ کیا ہے کہ پانچ سو افراد نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر ہتھیار بند نہ تھے۔اور ان میں سے کسی کا تعلق حماس سے نہیں تھا۔ ہر روز تقریباً 15 اسرائیلی فوجی جہنم واصل کیے جارہے ہیں اور نیتن یاہو نے دسمبر کے آخر میں اعتراف کیا ہے کہ ہمیں اس جنگ کی بہت بڑی قیمت دینا پڑرہی ہے۔غزہ سے ہر روز اسرائیل پر راکٹ اور ڈرون پھینکے جارہے ہیں اور لبنان کی سرحد پر حزب اللہ بھی عسکری کاروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔اسرائیل کے ایک سابق فوجی نے کہا ہے کہ حماس کو پیچھے دھکیلنے کے تمام دعوے جھوٹے ہیں۔اس جنگ کے خاتمہ کے کوئی آثار نہیں کیوں کہ حماس مستحکم ہے اور اس کے فنا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ہر روز اسرائیلی فوج سخت مقابلوں سے دوچار ہے۔

اسرائیل کسی اہم حماس رہنما کو گرفتار کرنے یا شہید کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ دسمبر 2023 میں اس نے چار حماس رہنماؤں کی گرفتاری کے لیے انعامات کا اعلان بذریعہ عوامی اشتہارات کے کیا ہے۔حماس کے غزہ کے قائد شیخ یحییٰ کی گرفتاری پر چار لاکھ ڈالر کا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ شیخ محمد جو حماس کے فوجی دستوں کے رہنما ہیں ان کی گرفتاری کے لیے ایک لاکھ ڈالر کا انعام مقرر کیا گیا ہے۔شیخ محمد کو اغوا اور قتل کرنے کی اسرائیلی فوج کئی برسوں سے کوشش

کر رہی ہے۔ دونوں شیوخ علمائے دین ہیں اور مدت دراز سے زیر زمین جہاد کی سربراہی فرما رہے ہیں۔ اشتہاری مہم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیلی دہشت گرد حماس کی قیادت کو بازیاب کرنے میں ناکام ہے۔

پورے غزہ میں حماس نے زیر زمین سرنگوں کا ایک وسیع جال قائم کیا ہوا ہے جو دہشت گرد حملہ سے محفوظ ہے۔ یہ سرنگیں 15 سال پہلے سے تعمیر کی گئی ہیں اور سیکڑوں میل تک پھیلی ہوئی ہیں اور اسرائیلی مقبوضہ مغربی ساحل تک ان کی توسیع کے امکانات موجود ہیں۔ اسرائیلی مبصرین اعتراف کرتے ہیں کہ حماس سخت مقابلہ کر رہی ہے اور فدائی حملہ جاری رکھے ہوئے ہے۔

اسرائیلی منصوبہ بندی یہ ہے کہ پہلے حماس کی حکومتی انتظامیہ کا خاتمہ کیا جائے۔ پھر مجاہدین کو منتشر اور قائدین کو قتل کیا جائے۔ ان اہداف کے حصول کے فی الحال کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ حماس نے اس منصوبہ بندی کو ناکام بنانے کی مدت سے تیاری کی ہے۔ اور ایک نظم قیادت قائم کیا ہے جس میں صفِ اول کی قیادت کی شہادت یا بے دخلی کے فوراً بعد ایک نئی قیادت اور کمانڈ سسٹم قائم کیا جا سکتا ہے۔ حماس نے جہاد جاری رکھنے کے لیے ہر گھر، ہر سڑک، ہر بازار میں مزاحمت کرنے کی تیاری کر رکھی ہے۔ ایک اسرائیلی مبصر کے مطابق اسرائیلی فوج اس قسم کی جنگ لڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اسرائیل کی ملٹری ڈاکٹرائن کم عرصہ جاری رہنے والی محدود جنگوں کے لیے وضع کی گئی ہے۔ غزہ میں جنگ جیتنے کا کیا سوال اسرائیل تو اس جنگ کو مغربی ساحل اور دیگر فلسطینی علاقوں میں پھیلنے سے روکنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔

سامراج عوامی جنگوں میں عموماً ناکام ہوتا ہے۔ وہ نہ چین میں ماؤسٹوں کو شکست دے سکا نہ ویت نام میں ویت کانگ کو، نہ کولمبیا میں FARC کو، نہ افغانستان میں طالبان کو، نہ بوکو حرام کو، نہ القاعدہ کو، نہ داعش کو اور نہ اسلامی جہاد کو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوامی جنگ لڑنے والے شکستوں اور پسپائیوں کو فتح میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب تک حماس کو فلسطینی عوام کی حمایت حاصل رہی اور جب تک وہ صہیونی حکومت اور ریاست کے خلاف جدوجہد کرتی رہتی ہے اس وقت تک اس کو ختم کرنے کا کوئی امکان موجود نہیں۔

امارتِ اسلامیہ فلسطین کا قیام ممکن ہے۔ لیکن اس میں کئی دہائیاں لگیں گی کیوں کہ اس

ہدف کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل پالیسیاں اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

1۔ حماس صہیونی ریاست کے انہدام اور قیامِ امارتِ اسلامیہ فلسطین کے عزم پر ثابت قدم رہے۔ کسی ایسے سمجھوتے پر راضی نہ ہو جو صیہونی ریاست کے وجود کو تسلیم کرتا ہو۔ جہادی عمل کو غزہ سے پھیلانے اور پی ایل او کو مغربی ساحلی علاقے سے بے دخل کرنے کی جدوجہد کرے۔ گرین لائن کو پار کر کے اسرائیل کے بڑے شہروں میں جہادی سرگرمیاں جاری رکھنے کی استطاعت پیدا کرے۔

2۔ علاقہ کی دو اسلامی حکومتیں ایران اور افغانستان حماس کی غیر مشروط حمایت جاری رکھیں۔ حزب اللہ عراق اور یمن کی اسلامی تحریکیں حماس کی اعانت اور کارروائیوں میں شرکت جاری رکھیں۔ ایران جلد از جلد نیوکلیئر ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کر لے۔

3۔ غیر اسلامی سیکولر مسلم ریاستوں میں اسلامی جماعتوں اور حلقوں سے رابطہ استوار کیا جائے اور انہیں ہمہ گیر امریکہ مخالف جدوجہد کی مہمات کے اجرا پر آمادہ کیا جائے۔ پوری مسلم دنیا میں یہ تاثر دیا جائے کہ یہ جنگ امریکی سامراج کے خلاف جہاد ہے اور امریکی مفادات کو مجروح کرنے اور امریکا کو اس جنگ کی بھاری معاشی اور تزویراتی قیمت دینا ضروری ہے تا کہ وہ اپنے آلہ کار اسرائیل کی اعانت سے باز آنے پر مجبور ہو جائے۔

4۔ امریکا اور یورپ میں امن پسند تحریک سے غیر حقیقت پسندانہ توقعات نہ قائم کی جائیں۔ یہ درست ہے کہ جنوبی افریقہ کی اپارتھائیڈ حکومت کے خلاف تقریباً نوے سالہ جدوجہد کو کامیاب بنانے میں ان مہمات نے اہم کردار ادا کیا تھا لیکن اس کامیابی کے نتیجہ میں منڈیلا سامراج کے ہاتھ بِک گیا اور ساؤتھ افریقہ میں ایک سرمایہ دارانہ جمہوری حکومت ہی قائم ہوئی۔ امن پسند تحریک استعمار کو انقلابی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ان سے تعاون سے وقتی فوائد تو حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن جنوبی افریقہ اور لاطینی امریکا کے تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان وقتی فوائد کی بھاری نظریاتی اور تزویراتی قیمت آخر کار دینا پڑتی ہے۔

اشاریہ البرہان ۲۰۲۳ء

جنوری ۲۰۲۳ء

O فکرونظر — المیہ — مدیر — ۴

O تعلیم و تربیت

- سماجی علوم اور دینی تقاضے — احمد جاوید — ۵
  سماجی علوم کی اسلامی تشکیل نو مسلم اہل علم پر فرض ہے
- تحریک اصلاحِ تعلیم کا نیا منصوبہ — ڈاکٹر محمد امین — ۱۵
  عمرانی علوم اور ان کے نصابات کی اسلامی تشکیلِ نو
- اہم تعلیمی ادارے چرچ کے حوالے — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۶
- تجدد گمراہی ہے اور قابل ردّ ہے — مدیر — ۲۹
  شعبہ علوم اسلامیہ کے سربراہ متنبہ رہیں
- سندھ میں تعلیم کو غیر اسلامی بنانے کے اقدامات — محمد عظیم صدیقی — ۳۲

O اسلام اور پاکستان

- ایک اور گتھی سلجھ گئی — اوریا مقبول جان/ مدیر — ۳۵
  پاکستان میں عدم نفاذِ شریعت اور مولانا فضل الرحمٰن کا کردار

O تفہیم دین

- عصر حاضر کا سب سے بڑا چیلنج: زوالِ امت — مدیر — ۴۰
- نام نہاد 'اسلامی بینکاری' - ایک تجزیہ — اوریا مقبول جان — ۴۳

O فکرودانش

پاکستان میں تبدیلی، خصوصاً اسلامی تبدیلی، ممکن ہی نہیں — مفتاح اسماعیل — ۵۳

O تزکیۂ نفس

- ہم خیر القرون جیسا معاشرہ کیوں نہیں چاہتے؟ (۲) — سید خالد جامعی — ۵۷

O میں نے زندگی سے کیا سیکھا (۱۱)

- اِک شجر سایہ دار تھا، نہ رہا [خودنوشت] — مدیر — ۶۲
- کچھ الاستاذ ڈاکٹر محمد امین صاحب کے بارے میں — حافظ عمران طحاوی — ۶۹

O اشاریہ

اشاریہ البرہان ۲۰۲۲ء — ادارہ — ۷۵

English Section ۸۲

Iran should support Afghanistan — Syed Haider Abbas

فروری ۲۰۲۳ء

O فکرونظر — یہ تنہائی — مدیر — ۴

O تعلیم و تربیت

- دینی مدارس کے نصاب ونظام پر نظرثانی کی ضرورت — مفتی تقی عثمانی — ۵
- سماجی علوم اور دینی تقاضے (آخری قسط) — احمد جاوید — ۱۰
  سماجی علوم کی اسلامی تشکیل نو مسلم اہل علم پر فرض ہے
- افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ — ڈاکٹر محمد امین — ۲۰
- قاسم علی شاہ صاحب کی خدمت میں — مدیر — ۲۹
  اصل چیز قوم کی تعلیم و تربیت ہی ہے

O تفہیم مغرب

- مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی — انجینئر گلبدین حکمت یار — ۳۲
- مغرب کا معاشی نظام ایک سراب ہے — اوریا مقبول جان — ۳۵
- یورپ اور مغرب میں انسانی کتے — ڈاکٹر محمد باقر خاکوانی — ۴۱

O افغانستان

- افغانستان - ملا عمرؒ کی پالیسیوں پر اصرار — رشید صافی — ۴۲
- پاک افغان تعلقات میں امریکی کردار — ۴۵
- افغانستان میں خواتین کی تعلیم اور ملازمت — مدیر — ۴۸
  مغربی ممالک اور سیکورٹی کونسل کے مطالبات

O تفہیم دین

- اسلام کا معاشی نظام کہاں ہے؟ — ۵۰
- ہم خیر القرون جیسا معاشرہ کیوں نہیں چاہتے؟ (۳) — سید خالد جامعی — ۵۲
- پاکستان میں غلبۂ اسلام بذریعہ قانون سازی — ۵۷
- 'امت' کا تصور کہاں کھو گیا؟ — مدیر — ۶۰

O فکرودانش

انسانی آبادی کی منصوبہ بندی اللہ کررہا ہے — رضی الدین سید — ۶۳

O کس قیامت کے یہ نامے

البرہان کے نام [تبصرے، تنقید، مشورے] — ۷۴

English Section ۸۲

Stabilizing the Economy — Dr. Javaid Akbar Ansari
An Islamic Revolutionary Approach

مارچ ۲۰۲۳ء

O فکرونظر — مَن انصاری إلی اللہ؟ — مدیر — ۴

O تعلیم و تربیت

- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب — شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ — ۵
- علم کا مقصد کیا ہے؟ — مولانا عبدالماجد دریابادیؒ — ۱۱
- دینی مدارس کے نصاب ونظام پر نظرثانی کی ضرورت — مفتی تقی عثمانی — ۱۳
- مغرب کی سوشل سائنسز قابل ردّ ہیں — ڈاکٹر محمد امین — ۱۹
  UMT لاہور میں سیمینار سے خطاب
- بڑھتا ہوا الحاد اور دینی مدارس کے علماء کا رویہ — ابوبکر قدوسی/ ڈاکٹر محمد اکرم — ۲۲

O اسلام اور پاکستان

- پاکستان کے اخلاقی، سیاسی، معاشی بحران کا حل — پروفیسر عبدالخالق سہریانی — ۲۵
- کیا پاکستان ایک غریب ملک ہے؟ — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۷

O تفہیم مغرب

- مغرب کی اندھی پیروی اور اس پر ایمان بالغیب — سید خالد جامعی — ۲۹
- تم مغرب پر تنقید کیوں کرتے ہو؟ — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۳۲
  جناب محمد دین جوہر کے افکار عالیہ پر ایک نظر

O افغانستان

- افغانستان میں معاشی استحکام — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۴۰

O تفہیم دین

زلزلے کیوں آتے ہیں؟ — مدیر — ۴۸

O تزکیۂ نفس

نماز کا ایک انوکھا اور حیران کن پہلو — ادارہ — ۴۹

O تبصرۂ کتب

''پسِ قانون'' از آصف محمود — پروفیسر سعدیہ قریشی — ۵۰
پاکستانی قانون پر برطانوی نوآبادیاتی اثرات

O بزم قارئین

البرہان کے نام خط — ادارہ — ۵۳

English Section ۵۶

The Truth about Feminism — Dr. Javead Akber Ansari

اپریل ۲۰۲۳ء

O مقالۂ خصوصی

فریضۂ رمضان کی حکمتیں — سید ابوالحسن علی ندویؒ — ۴

O فکرونظر

رجوع الی القرآن - ضرورت، اہمیت اور طریق کار — مدیر — ۹

O تعلیم و تربیت

- اسلامی تہذیب کے احیاء میں تعلیم کا کردار — ڈاکٹر محمد امین — ۱۲
- یونیورسٹیوں کا حیاباختہ ماحول — حافظ عمران طحاوی — ۲۰
- مجوزہ قومی نصاب کا ایک جائزہ — ۲۲

O تفہیم مغرب

میڈیکل سائنس یا کھیل تماشہ — سید خالد جامعی — ۲۷

O افغانستان

افغانستانی معیشت مستحکم ہو رہی ہے — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۲۹

O تفہیم دین

- فکر اسلامی - روایت، جدت اور جدیدیت — ڈاکٹر محمد امین — ۳۴
- فکر اسلامی پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی کانفرس — حافظ عمران طحاوی — ۴۲
- اِمیج کلچر — مکرم محمود — ۴۴
- ترکی میں اسلامی تبدیلی کیسے آئی؟ — پروفیسر عاصم حفیظ — ۴۷

O تزکیۂ نفس

تصوف کی تجدید - ضرورت، اہمیت اور طریقِ کار — مدیر — ۴۹

O تبصرۂ کتب

Big Capital in an Unequal Word — اوریا مقبول جان — ۵۳
English Etiquette for Indian Gentlemen — آصف محمود — ۵۸

English Section ۶۶

Truth about Democracy — Dr. Javead Akber Ansari

مئی ۲۰۲۳ء

○فکر و نظر
- بھوک - بھوک اور ننگ - اور مہنگائی ۴
- رمضان اور قرآن — مدیر ۵
○تعلیم و تربیت
- دینی مدارس کے نصاب و نظام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے (آخری قسط) — مولانا مفتی تقی عثمانی ۶
- تجاویز برائے قومی نصاب — پروفیسر محمد رضوان الحق و محمد ابراہیم ۱۴
- سکولوں میں قرآن حکیم کی تدریس — سلیم طارق لون ۲۵
○تفہیم دین
- پاکستان کے موجودہ معاشی بحران کا حل — ڈاکٹر محمد امین ۲۸
○فقہ و قانون
- سپریم کورٹ کا ایک اور غیر شرعی فیصلہ — مدیر ۴۴
- پارلیمنٹ سپریم ہے یا عدلیہ؟ ۶۲
○تفہیم مغرب
- جدیدیت کی آئیڈیالوجی غیر اسلامی ہے — ڈاکٹر رشید ارشد ۶۶
- کیا جدیدیت قابل ردّ نہیں؟ — حافظ عمران طحاوی ۷۱
○تزکیۂ نفس
نفسِ لوّامہ کی تلاش — ڈاکٹر خورشید رضوی ۷۶
English Section ۸۲
Human Rights: An Imperialist Weapon
Dr. Javead Akber Ansari

جولائی ۲۰۲۳ء

○تعلیم و تربیت
- مفتی تقی عثمانی صاحب نے تفہیم مغرب کا کورس منظور کرلیا — سید خالد جامعی ۵
- واہ کینٹ کے ماڈل تعلیمی ادارے (آخری قسط) — محمد سلیم اختر ۹
- ایک منفرد نصابی ورکشاپ — مدیر ۱۳
- مساجد و دینی مدارس کے اساتذہ کی کم تنخواہیں — ڈاکٹر طفیل ہاشمی ۱۴
- خاموش ٹیچر — محمد عمیر ۱۶
○تفہیم دین
- مولانا مودودیؒ - ایک عبقری شخصیت — مدیر ۱۸
- کیا 'اجتماعی قربانی'' جائز ہے؟ — مولانا احتشام صدیقی ۲۱
- جدید قومی ریاست میں علماء کرام کا نہ وقارنہ حیثیت — سید خالد جامعی ۲۳
- تبلیغی جماعت اور مغرب — سید خالد جامعی ۳۲
○اسلام اور پاکستان
- محترم سراج الحق صاحب کے نام خط — مدیر ۳۴
- ۹ مئی کے بعد کا بحران اور اس کا حل — ڈاکٹر محمد امین ۲۵
- غلامی سے نکلنے کا راستہ — منصور علی خان ۳۸
- پاکستان میں اسلامی نظام کی ناکامی کا بڑا سبب — غلام نبی کشافی ۳۹
○فقہ و قانون
ٹرانس جینڈرز ایکٹ پر وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ — ڈاکٹر محمد مشتاق احمد ۴۱
○تزکیۂ نفس
اللہ سے تجارت کیجیے — ادارہ ۴۴
○عالم اسلام
افغان زرعی مسئلے پر توجہ دیں — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۴۸
○البرہان کی ڈاک/مکالمہ
البرہان کے نام — مدیر ۵۰
موضوع: اسلام کے اجتماعی اداروں کی تشکیل و تدوینِ نو
○تبصرۂ کتب
'سر سید احمد خاں - تاریخ کی میزان میں' — ادارہ ۵۴
از شاہنواز فاروقی
English Section
- Book Review: 'Medieval Economy' By Muhammad Munir Ahmad — *Dr. Javead Akber Ansari* ۶۲
- Important Recommendations for Islamization of Pakistan — *Salim Tariq Lone* ۶۶

جون ۲۰۲۳ء

○فکر و نظر
- اسلام کے اجتماعی اداروں کی تشکیل و تدوین نو کرنے کا ایک بہت اہم اور بڑا کام ۴
- پاکستان: خوفناک سیاسی و معاشی بحران کا حل ۷
○تعلیم و تربیت
- انگلش میڈیم: غلامی کا جدید ذریعہ — اوریا مقبول جان ۸
- واہ کینٹ کے ماڈل تعلیمی ادارے — محمد سلیم اختر ۱۲
- گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا تعلیمی پروگرام — ادارہ ۲۰
○تفہیم دین/مکالمہ
'نظام' کی تبدیلی اور 'خلافت' کی بحالی؟ — ڈاکٹر محمد امین ۲۵
○فقہ و قانون
- ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق ایک اہم فقہی مسئلہ — ڈاکٹر حسن مدنی ۳۴
- یورپین کورٹ برائے بنیادی حقوق کا فیصلہ — ترجمہ: مدیر ۴۸
شریعت سیکولرزم، جمہوریت اور بنیادی حقوق کی مخالف ہے
○اسلام اور پاکستان
اسلام میں نفاذِ شریعت اور علماء سُوء — رانا شمس الرحمٰن ۵۲
○اسلام اور مغرب
اسلام، مغربی تہذیب اور قومی ریاست — مدیر ۵۴
ترجمان القرآن کے ایک مضمون کا تجزیہ
○البرہان کی ڈاک/مکالمہ
البرہان کے نام — ادارہ ۶۴
جدت اور جدیدیت - ترکی کے دینی مدارس
اور امیج کلچر کی بحث

اگست ۲۰۲۳ء

○فکر و نظر
- ۱۴/اگست کا نوحہ — مدیر ۴
- لعل و گہر (حاصلِ مطالعہ) ۵
○مقالۂ خصوصی
مغرب کی الحادی تہذیب کا سیلابِ بلاخیز کیا بچاؤ کی کوئی صورت ہے؟ — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین ۶
○تعلیم و تربیت
- دینی مدارس کے نصاب پر مفتی تقی عثمانی صاحب کی نظر ثانی — ڈاکٹر اختر حسن عزمی ۱۳
- پنجاب میں کیمبرج یونیورسٹی کے نصاب کا نفاذ — مدیر ۱۶
- تصوف کے اشغال کی شرعی حیثیت — مولانا محمد منظور نعمانیؒ ۱۸
- علماء کرام اور فتنۂ تصویر — جواد عبدالمتین ۲۴
○تفہیم دین
- اسلام کے اجتماعی نظاموں کی تدوینِ نو کا صحیح طریق کار - اجتماعی اجتہاد — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین ۲۷
- مسلم سرمایہ دارانہ ریاستوں میں اقامت دین کی تحریکوں کا لائحہ عمل — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۳۲
○اسلام اور پاکستان
- متجددین اور قادیانیت — مولانا عبدالرؤف فاروقی ۳۸
ڈاکٹر عمار ناصر اور ہمنواؤں کی خدمت میں
- تبلیغی جماعت کی جدوجہد کا نیا پہلو — مولانا محمد سہیل ۴۰
پوری زندگی میں مکمل دین کا احیاء
- سود کے خلاف جماعت اسلامی کی جدوجہد کے نتائج اور نظر ثانی کی ضرورت — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین ۴۳
○اسلام اور مغرب
- بلادِ کفار میں رہائش رکھنا خلافِ اسلام ہے — ڈاکٹر قیصر علی ۴۷

ستمبر ۲۰۲۳ء

O فکرونظر
- تجدد گمراہی ہے اور متجد دین گمراہ ہیں — مدیر — ۴
- چند فوری توجہ طلب دینی مسائل — ۶

O مقالۂ خصوصی
نفاذِ شریعت کا متبادل منہاج کیا ہے؟ — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۹

O تعلیم وتربیت
- صحیح تعلیم وتربیت اور رجوع الی القرآن ہی واحد حل ہے — ڈاکٹر نجیب الحق — ۳۰
- تعلیمی انڈسٹری میں حیرت انگیز انقلاب — ڈاکٹر طفیل ہاشمی — ۳۴
- تین اہم تعلیمی موضوعات پر پریس بریفنگ — حافظ محمد عمران طحاوی — ۳۸
- قومی ریاست میں علماء کرام کی بے قدری (۲) — سید خالد جامعی — ۴۰
- ہم اچھے مسلمان کیسے بنیں؟ — پروفیسر ارشد جاوید — ۸۳

O اسلام اور پاکستان
اصلاح عدلیہ کے لیے چند اہم تجاویز — سلیم طارق لون — ۴۴

O عالم اسلام/افغانستان
- افغان معیشت ترقی کی راہ پر گامزن — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۴۷
- افغان عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ (آخری قسط) — سید خالد جامعی — ۴۹

O فقہ وقانون
غیر عورت کے بیضہ سے پیدا شدہ اولاد کے مسائل (آخری قسط) — ڈاکٹر حسن مدنی — ۶۱

O تبصرۂ کتب
- امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل — لیاقت بلوچ — ۶۸
- ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کے تبصرے کا جواب 'اقامتِ دین کا صحیح منہج' — مدیر — ۷۱

O البرہان کی ڈاک — ادارہ — ۷۶
لیاقت بلوچ۔ حمید سیال۔ ملک شفقت حیات۔ رضی الدین سید

English Section ۸۲
Islamic Individuation and the Islamic Revolutionary Process: Book Review — Dr. Javed Akbar Ansari

اکتوبر ۲۰۲۳ء

O فکرونظر — یہ منافقت کب تک؟ — ۴

O تعلیم وتربیت
- اصطلاحات کا ترجمہ کرنا غلط ہے — ڈاکٹر عثمان احمد — ۵
- بچوں کی ابتدائی قرآنی تعلیم کے تقاضے — ڈاکٹر انوار احمد بگوی — ۸
- بچوں کے موبائل کی نگرانی کیجیے — عابد چوہدری — ۱۱
- علم نہیں، گانا سیکھیں — پروفیسر عاصم حفیظ — ۱۲
- فرسودہ نظامِ تعلیم کی تباہ کاریاں — محمد سلیم منہاس — ۱۳

O فہم دین
- پاکستان میں غلبۂ دین کا متبادل لائحہ عمل — ادارہ — ۱۶
مدیر کے مضمون پر قارئین کے تبصرے
- الخدمت وجماعت اسلامی: مغرب کی تحریک آزادئ نسواں — ڈاکٹر ابصار احمد — ۲۲
- کون سے علماء انبیاء کے وارث ہیں؟ — حافظ ڈاکٹر محمد زبیر — ۲۹
- قومی ریاست میں علماء کرام کی بے قدری — سید خالد جامعی — ۳۴

O غامدیت
- غامدی مکتبِ فکر کا تصورِ نظم قرآن — احمد جاوید — ۴۴
- علمی اختلافات میں ریڈ لائن کیا ہے؟ — مدیر — ۵۴
- انذار واصلاح کے اسلوب میں فرق — ۵۶

O تفہیم مغرب
- پاکستان کی حالیہ معاشی مشکلات اور ان کا حل — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۸
- مغربی تہذیب ایک دلدل ہے (۱) — ڈاکٹر احمد امتنان کاشف — ۶۳
- وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل — عامرہ احسان — ۶۶

O اسلام اور مغرب
مسلمانوں کی بلادِ کفار کو منتقلی حرام نہیں — ڈاکٹر انعام اللہ — ۷۰

O تبصرۂ کتب
کتاب نما: متعدد کتب پر تبصرہ — مدیر — ۷۳

English Section ۸۲
The Collapse of Liberal Democracy in Israel — Dr. Javed Akbar Ansari

نومبر ۲۰۲۳ء

O فکرونظر
مسجد اقصیٰ کی پکار — ۴

O تعلیم وتربیت
- کیا پنجاب یونیورسٹی کا قیام استعمار کی سازش تھی؟ — حافظ محمد عمران طحاوی — ۵
- پنجاب میں سرکاری تعلیمی اداروں کی پرائیوٹائزیشن — پروفیسر عاصم حفیظ — ۸
- قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ علم اور اہل علم پر ان کے اثرات — ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی — ۱۱
- اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت اور لائسنسنگ — ڈاکٹر محمد افضل بابر — ۲۲
- قرآن حکیم کی تعلیم سے نالاں یونیورسٹیوں کا کردار — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۴

O تفہیم دین
- سیرت النبی کی روشنی میں احیائے دین — ۲۶
- 'عصرِ حاضر میں احیائے اسلام' پر سیمینار — مدیر — ۳۱
- غلبۂ دین کا متبادل منہاج/مکالمہ — ۳۳

O تفہیم مغرب
- کیا ٹیکنالوجی غیر اقداری ہوتی ہے؟ — ڈاکٹر عثمان احمد — ۳۸
- مغربی تہذیب ایک دلدل ہے (آخری قسط) — ڈاکٹر احمد امتنان کاشف — ۴۲

O عالم اسلام/افغانستان
- طالبان کا افغانستان: چند غور طلب اختلافی امور — مدیر — ۴۷

O اسلام اور مغرب
مسلم معاشروں میں فیمنزم کا چیلنج — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۳

O البرہان کی ڈاک
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری۔ پروفیسر عبدالخالق سہریانی — ادارہ — ۶۳

English Section ۶۶
A Note on Women's Access to Dawah Activites — Dr. Javed Akbar Ansari

دسمبر ۲۰۲۳ء

O فکرونظر
نوحہ۔ لہولہو غزہ — مدیر — ۴

O تعلیم وتربیت
- دینی مدارس: اصلاحِ نصاب کی ایک تجویز — ڈاکٹر طفیل ہاشمی — ۵
- بنوں کا واقعہ — مدیر — ۶
- مسلم علم النفس اور جدید نفسیات — مکرم محمود — ۸

O فکرودانش/سیمینار
- عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کے تقاضے — ڈاکٹر محمد امین — ۱۵
- روداد سیمینار 'عصرِ حاضر میں احیائے اسلام' — حافظ عمران طحاوی — ۲۱

O تفہیم دین
- اسلام کا سیاسی نظام: عوام کی اکثریت کی بجائے میرٹ پر انحصار کے شرعی دلائل — مدیر — ۳۴
- ردِّ الحاد ودہریت پر اُردو زبان میں لکھی گئی کتب — ڈاکٹر حسیب احمد خان — ۴۵
- غامدی مکتبِ فکر: تجزیہ وتنقید کا صحیح منہج — ۵۰

O اسلام اور پاکستان
- 'اسلامی جمہوریت' سے اسلام کیوں نہیں آسکتا؟ — ڈاکٹر رشید ارشد — ۵۱
- ۲۰۲۴ء کے انتخابات: دینی سیاسی جماعتوں کا لائحہ عمل — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۳

O تفہیم مغرب
- امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل — خالد بیگ — ۶۱
- جدیدیت کیا ہے؟ — سید خالد جامعی — ۶۸

O عالم اسلام/افغانستان
افغانستان: دوسرے سال کی کارکردگی۔ ایک نظر میں — مدیر — ۷۶

English Section ۸۲
Disputed Dilemmas - Interactions of Pakistani Media with the State and Islam — Dr. Javed Akbar Ansari

* In Angola, Mozambique, D. R. Congo, Burkina Faso – 1,10,00,000 people
* In Afghanistan and Iraq – 2,00,000 people
* Sudan, South Sudan, Rwanda – 50,00,000 people
* Syria – 1,00,000 people
* Other countries – 70,00,000 people

Thus over 1991-2020 American terrorists are responsible directly and indirectly for over 40 million deaths and the slaughter continues in Ukraine, Palestine and several countries where American terrorists are fighting proxy wars.

US terrorist strategy is two pronged. On the one hand it seeks to intensify conflict among nations so that the American economy and its military industrial complex continues to thrive and make huge profits from arms sales and to safeguard the international regulatory systems which underwrite its global capitalist hegemony.

On the other hand the terrorist strategy is focused on avoiding American death – for the cowardly American people though enthusiastic killers of other people are afraid of death. Thus the terrorist strategy seeks to persuade the foreign allies – Ukrainians, Israelis, Colombians, Indians and Pakistanis – to be willing to die for American terrorism. This is the raison d'être of the American imperialist effort in its allied countries – its exercise of soft power through cultural initiatives, educational support – as well as military 'aid.' Allies must be fully aware of this essential objective of American foreign policy when responding to the diplomatic initiatives of the United States.

companies, international financiers, humanitarian aid agencies, universities and Think Tanks, and plays a major role in macroeconomic crisis management. The American National Democratic process is geared to reviving American terrorist machine. The American people are enthusiastic supporters of American terrorism as long as it does not lead to the loss of too many American lives.

The end of the Cold War (in 1991) led to intensification of American terrorism. NATO was re-launched and given the task of inventing new enemies – Islam, China, Russia, and Venezuela. In 1991, America promulgated the Wolfowitz Doctrine which said that America would henceforth use its military power to bring about regime change in "strategic" countries throughout the Middle East and North Africa (Iran, Syria, Sudan and Saudi Arabia in particular). The objective of continued American terrorism is stated in the Brzezinski Doctrine as the consolidation of America's position as the only global power.

To achieve this objective American terrorists have during 1991-2020 launched 251 military interventions in foreign countries. As Jimmy Carter former US president, has said "America is the most warlike nation in the history of the world". Since 1991 America has entered an era of "hyper imperialism" and has vastly expanded its military bases network throughout the world.

Currently (2024) American terrorists operate from more than 850 military bases – including the semi-secret helipad bases – in 85 countries. Over 400 of these surround China.

During 1991-2020 American terrorists have following:

* In Vietnam, Cambodia, Korea and Laos – 137,00,000 people

Dr. Javed Akbar Ansari

American Terrorism

America was born as a terrorist state. For over two centuries it conducted and prolonged war of terror which led the slaughter of 80 million Red Indians and the loot and occupation of an entire continent. This is undoubtedly the greatest crime committed in the history of mankind.

American terrorism has continued throughout its history. In the 19th century it produced the Monroe Doctrine justifying its aggression (ongoing and intended) in Latin America and seized over half of the territory of Mexico and fought a bloody war with Spain to the colonization of Puerto Rico, Cuba and the Philippines. During the first half of the 20th century it fought Germany and Japan. During the cold war period it terrorized Korea and Vietnam and fought proxy wars in Angola, Mozambique and many other African countries. By 1959 it had established 275 major military bases in 31 countries. Besides this, it set aside base areas around the world for emergency occupation. Over a million troops were stationed in its bases. The Truman Doctrine (issued in 1947) committed America to military intervention in all countries "threatened by armed minorities"! This Truman Doctrine has been reformulated as the UN "Right to Protect Declaration" (2004) which gives the United States the right to militarily intervene wherever it whishes.

American terrorism has deep national socio-economic roots. The US military budget which now effectively exceeds 1 trillion for 2024 provides invaluable support to the military-industrial complex which includes multinational